

مجله عدالتی نظائر



جلد ۱، جولائی - ستمبر ۲۰۲۳

اردو زبان میں عدالتی نظائر کی تلخیص پر مشتمل

آئین و قانون کی دنیا کا پہلا مجلہ

مدیر اعلیٰ

مدثر اقبال

مشیر

سجاد حمید پوسفرنی

سرپرست

محمد ذوالقرنین ایڈوکیٹ

مشیر

سلمان احمدان



برقی ویب گاہ: <https://courtingthelaw.com/>



"مجلہ عدالتی نظائر" آئین پاکستان اور اسلامی شریعت کے قائم کردہ مثالوں پر یقین رکھتا ہے۔ تاہم اس مجلے میں شائع ہونے والی تمام افکار اہل قلم شرکاء کی ذاتی رائے ہیں۔ اس مجلہ کا ان سے کلی اتفاق ضروری نہیں۔

مجلہ عدالتی نظائر درج ذیل عدالتوں کے تمام موضوعات کے متعلق فیصلوں کے اردو میں ترجمے / تلخیص کا خیر مقدم کرتی ہے۔

- (1) عدالت عظمیٰ
- (2) وفاقی شرعی عدالت
- (3) عدالت عالیہ اسلام آباد
- (4) عدالت عالیہ پشاور
- (5) عدالت عالیہ لاہور
- (6) عدالت عالیہ بلوچستان
- (7) عدالت عالیہ سندھ
- (8) تمام ضلعی عدالتیں
- (9) مرکزی عدالت گلگت بلتستان
- (10) مرکزی عدالت آزاد جموں و کشمیر
- (11) خصوصی عدالتیں
- (12) وفاقی اور صوبائی محتسب
- (13) بین الاقوامی عدالت انصاف



جملہ حقوق محفوظ ہے۔ پیشگی تحریری اجازت کے بغیر مجلے کے کسی حصہ کی کسی بھی قسم کی اشاعت قانونی اور اخلاقی جرم ہے۔

مجلہ عدالتی نظائر کے اگلے شمارے میں اپنی تلخیص شائع کرنے کے لئے اس میل پر اپنی تحقیق بھیج دے۔

editor.majala@gmail.com

مجله عدالتی نظائر

جولائی - ستمبر ۲۰۲۳ء

مجلس ادارت

سرپرست:	محمد ذوالقرنین، ایڈوکیٹ و ریسرچ انیسر کے۔ پی بار کونسل	مدیر اعلیٰ:	مدثر اقبال، طالب علم شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
مدیر:	محمد قمر الحق، ناظم، جامعہ محمدی شریف، چینوٹ	شریک مدیر:	ریحان اللہ، طالب علم شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
نائب مدیر:	عاقب فاروق، طالب علم شعبہ قانون، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور	شریک مدیر ۲:	محمد اسد، طالب علم شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
شریک مدیر ۳:	افراسیاب خان، طالب علم شعبہ شریعہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد		

مجلس مشاورت

سلمان احمدان
ایڈوکیٹ ہائی کورٹ و بانی قانون دان

سجاد حمید یوسفزئی
ایڈوکیٹ ہائی کورٹ و بانی آئین و قانون

فہرست

نمبر شمار	عنوان	تلخیص نگار	صفحہ
	تلخیص نگاران		۵
	پیش گفتار		۶
	دیوانی فیصلے		
۱	غیر حاضری کی بنیاد پر سکول سے نکالے جانے والے طلباء کے بارے میں عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ	محمد ذوالقرنین	۷
۲	پہلی سماعت پہ ہی دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنے کے حوالے عدالت عظمیٰ کا بہت اہم فیصلہ	سجاد حمید یوسفزئی	۸
۳	توہین عدالت کے متعلق عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ	محمد اسد	۹
۴	غیر ملکی ثالث کے فیصلے کو پاکستان میں نافذ کرنے پہ لاہور عدالت عالیہ کا فیصلہ	مدثر اقبال	۱۰
۵	پیمرا اوشکیا کی کونسل کے دائرہ اختیار سے متعلق عدالت عظمیٰ کا اہم فیصلہ	علی شہباز انجم	۱۲
۶	ملزم کا عدالتی کارروائی سے مسلسل غیر حاضر رہنے پر بلوچستان عدالت عالیہ کا ایک اہم فیصلہ	عاقب فاروق	۱۴
۷	اعلیٰ عدالتوں کی جانب سے فیصلے محفوظ کر کے تاخیر سے سنانے کے بارے میں عدالت عظمیٰ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ	محمد ذوالقرنین	۱۵
۸	آرٹیکل ۲-۱ اے (قرارداد مقاصد) کی پاکستانی آئین میں حیثیت پر عدالت عظمیٰ کا اہم فیصلہ	محمد اسد	۱۷
۹	دیوانی مقدمات میں جرح کیے بغیر دستاویزی شہادت پہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اور بارثبوت ہمیشہ کس پر ڈالا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے اسلام آباد عدالت عالیہ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ	محمد اسد	۱۸
۱۰	مقدمات میں ہارنے والے فریق کو لاگت ادا کرنے یا ہر جانہ ڈالنے کے حوالے سے اسلام آباد عدالت عالیہ کا ایک مفصل فیصلہ	سجاد حمید یوسفزئی	۲۱
۱۱	عدالت عظمیٰ کا دیوانی مقدمہ جات میں گواہ کا بیان بذریعہ ویڈیو کا نفر نسنگ ریکارڈ کروانے کے حوالے سے ایک اہم فیصلہ	حمزہ خان	۲۱
۱۲	ماحولیات پہ معزز جج منصور علی شاہ صاحب کا ایک اہم فیصلہ	سجاد حمید یوسفزئی	۲۳
۱۳	ہراسانی پر جسٹس منصور علی شاہ صاحب کا ایک بہترین فیصلہ	سجاد حمید یوسفزئی	۲۴
	فوجداری فیصلے		
۱۴	توہین مذہب کے ایک مقدمے میں لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ	ڈاکٹر محمد مشتاق احمد	۲۶
۱۵	زنا بالجبر (ریپ) کے مقدمات میں تاخیر، ڈی این اے ٹیسٹ کا نہ ہونا اور ناقص تفتیش ملزم کی بریت کی بنیاد نہ ہونے پر عدالت عظمیٰ کا اہم فیصلہ	عاقب فاروق	۲۹
۱۶	منشیات کے کیسز کے طریقہ کار پر لاہور ہائی کورٹ، ملتان کے دور کئی میٹنگ کا اہم ترین فیصلہ	محمد زیشان حیات	۳۱
۱۷	منشیات کے کیسز میں ویڈیو گرافی کے استعمال پر پشاور عدالت عالیہ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ	مدثر اقبال	۳۳
۱۸	ڈاکٹر آئن آف کو پائیڈ فیملڈ کے حوالے سے پشاور عدالت عالیہ میٹنگ کا ایک اہم فیصلہ	محمد ذوالقرنین	۳۴
۱۹	دفعہ ۱۹۲ اور ۲۶۵-سی، مجموعہ ضابطہ فوجداری، ۱۹۸۸ء کا ایک اہم فیصلہ	کامران علی چند	۳۶

۳۷	احتشام الحق	ایف آئی آر کے اندراج کے بعد کیا اس ایف آئی آر کو ختم کیا جاسکتا ہے کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ	۲۰
۳۹	محمد ذوالقرنین	عدالت عظمیٰ کا نمائندہ نمونہ کے حوالے سے اہم فیصلہ	۲۱
		عائلی معاملات کی بابت فیصلے	
۴۰	مدثر اقبال	فقہ جعفریہ میں بے اولاد بیوی کے میراث کے حوالے سے لاہور عدالت عالیہ کا فیصلہ	۲۲
۴۱	سجاد حمید یوسف زئی	لاہور عدالت عالیہ کی خلع، طلاق اور تنسیخ نکاح پہ بہت ہی اہم ججمنٹ	۲۳
۴۲	محمد ذوالقرنین	پڑپوتے کے میراث کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ	۲۴
۴۳	محمد ذوالقرنین	نکاح کے لئے کم سے کم عمر کی شرط اور کم عمری کی شادی کے کیس میں ضمانت کے حوالے سے اسلام آباد عدالت عالیہ کا ایک اہم فیصلہ	۲۵
۴۵	محمد ذوالقرنین	ہبہ کے متعلق عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ	۲۶
۴۶	محمد ذوالقرنین	حق حضانت کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ	۲۷
۴۸	محمد ذوالقرنین	باپ کی زندگی میں ہی فوت ہونے والے بیٹے کی بیوہ کی میراث کے حوالے سے پشاور عدالت عالیہ کا ایک اہم فیصلہ	۲۸
۴۹	محمد ذوالقرنین	وراثت کے مقدمات میں میعاد سماعت کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ	۲۹
۵۱	محمد ذوالقرنین	بیوی بچوں کے حق نان و نفقہ کے حوالے سے لاہور عدالت عالیہ کا ایک اہم فیصلہ	۳۰
۵۳	حمزہ خان	پشاور عدالت عالیہ کا طلاق الفار کے بعد مر جانے کی صورت میں بیوہ کے حق وراثت کے حوالے سے اہم فیصلہ	۳۱
۵۶	فرقان احمد	رٹ پٹیشن میں حقائق کی تحقیق کے حوالے سے ہائی کورٹ کے اختیارات پر فیصلہ	۳۲

ترجمہ / تالیفیں نگاران

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد

چیئر مین، شعبہ قانون، شفاء تعمیر ملت یونیورسٹی اسلام آباد

محمد ذوالقرنین

ایڈووکیٹ و ریسرچ آفیسر خیبر پختونخواہ بار کونسل

سجاد حمید یوسفزئی

ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

محمد اسد

طالب علم، شریعہ اینڈ لاء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

مدثر اقبال

طالب علم، شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

علیشبہ انجم

طالب علم، شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

عاقب فاروق

طالب علم، شعبہ قانون، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

حمزہ خان

ایڈووکیٹ، خیبر پختونخواہ بار کونسل

محمد ذیشان حیات

ایڈووکیٹ، ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن، نوشہرہ

کامران علی چنہ

ایل۔ ایل۔ بی، دذوالفقار علی بھٹو یونیورسٹی آف لاء، کراچی

احتشام الحق

طالب علم، شریعہ اینڈ لاء، اسلامیہ کالج پشاور

فرقان احمد

طالب علم، شریعہ اینڈ لاء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

پیش گفتار

پاکستان میں قانون سے متعلق تحقیق کی روایت بہت زیادہ مضبوط و دیر پا نہیں ہے اور ہمارے ہاں قانون کی تدریس و تحقیق کے میدان پر بھی قانون کی پریکٹس کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے اس حوالے سے بعض خوشگوار تبدیلیاں دیکھنے میں آرہی ہیں اور قانون کی تعلیم اور پریکٹس کے ساتھ ساتھ تحقیق کے میدان میں بھی نئے نئے تجربات سامنے آئے ہیں۔ مجلہ عدالتی نظائر اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس بارے میں سب سے زیادہ خوش آئند بات یہ ہے کہ نوجوان و کلاء اور قانون کے طلباء نے مل کر اردو میں اہم عدالتی فیصلوں کی تلخیص پیش کرنے کی شاندار روایت کو بہت منظم اور مربوط طریقے سے آگے بڑھایا ہے۔ عدالتی فیصلوں تک عام فہم انداز میں رسائی قانون کے میدان میں تحقیق کی اولین کڑی ہے۔

مابعد نوآبادیت کے دور میں قانونی نظام اور عدالتوں کے فیصلوں کو عام آدمی کی دسترس میں اس انداز میں لے کر آنا بہت ضروری ہے کہ اس نظام کے حقیقی اسٹیک ہولڈرز یعنی عوام کو پوری طرح ادراک ہو سکے کہ آخر یہ نظام کس حد تک ان کے حقوق کی نگہبانی کرتا ہے۔ ہمارے عدالتی نظام اور عدلیہ کے فیصلوں کی زبان انگریزی ہے اور یہاں ہی سے عام آدمی کے لئے پورا نظام انصاف اجنبی بن جاتا ہے۔ نظام انصاف کی یہ اجنبیت عدم اعتماد کو جنم دیتی ہے۔ جناب جسٹس جو ادالیں خواجہ نے اردو زبان کے نفاذ کے لئے سپریم کورٹ کا فیصلہ صادر کر کے اس خلیج کو پائنے کی ایک کوشش ضرور کی تھی مگر بد قسمتی سے یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ ملک کی مختلف جامعات میں قانون کی تعلیم اور تحقیق کا سلسلہ بھی انگریزی زبان ہی میں جاری ہے۔ ان حالات میں مجلہ عدالتی نظائر کی ٹیم نے ایک غیر معمولی کاوش کے طور پر عدلیہ کے اہم فیصلوں کو اردو قالب میں خلاصہ کے طور پر پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ابتدائی طور پر یہ کام فیس بک اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر اعلیٰ عدلیہ کے فیصلوں پر مختصر تبصروں کی صورت میں شروع ہوا جو اب باضابطہ شکل اختیار کر کے ایک ڈیجیٹل مجلے کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ میں مجلہ قانونی نظائر کی پوری ٹیم اور ان کے معاونین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ وہ اس مفید سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر عزیز الرحمن

صدر نشین، کلیہء قانون، جامعہ قائد اعظم

غیر حاضری کی بنیاد پر سکول سے نکالے جانے والے طلباء کے بارے میں عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ²

کیس کے حقائق:

آئینہ حیات نامی مدعیہ جو کہ پشاور ماڈل سکول سے اپریل ۲۰۱۸ء سے لے کر مارچ ۲۰۱۹ء تک جماعت نہم کا امتحان پاس کرنے کے بعد جماعت دہم میں داخلہ لیتی ہیں لیکن مدعیہ سکول ہذا ۵ نومبر ۲۰۱۸ء سے غیر حاضر ہو جاتی ہیں جس پر ۲۳ نومبر ۲۰۱۸ء کو اسے سکول سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ سکول کی جانب سے مدعیہ کا نام خارج کرنے کی ۲ وجوہات لکھی جاتی ہیں جن میں جنون ۲۰۱۸ء سے فیس کی عدم ادائیگی اور ۵ نومبر سے غیر حاضری شامل ہے۔ سکول سے نام خارج ہونے کے بعد مدعیہ ۲۰۱۸ء کے بقیہ سیشن میں سکول نہیں جاتی اور اس بنا پر سکول اس کا نام بورڈ امتحانات دینے کے لئے پشاور بورڈ بھیجنے سے انکار کر دیتا ہے جس سے متاثر ہو کر مدعیہ پشاور عدالت عالیہ سے رجوع کرتی ہیں اور ابتدائی ریلیف کے طور پر ہائی کورٹ مدعیہ کو جماعت دہم کے امتحانات دینے کی اجازت مرحمت فرمادیتی ہے اور نتیجتاً مدعیہ بورڈ کا امتحان دیتی ہیں جس میں وہ پاس بھی ہو جاتی ہے لیکن یہاں پر مسئلہ یہ ہو جاتا ہے کہ پشاور عدالت عالیہ کا تفصیلی فیصلہ اس بنا پر اس کے خلاف آجاتا ہے کہ مدعیہ کے سکول میں حاضری ۶۶ فیصد سے کم ہے اور قوانین کے مطابق جس کی حاضری ۶۶ فیصد سے کم ہو تو وہ بورڈ کا امتحان دینے کا مجاز نہیں ہے۔

عدالت عالیہ کے فیصلے کے خلاف مدعیہ عدالت عظمیٰ سے رجوع کرتی ہے اور عدالت عظمیٰ کا ۳۳ کنٹی بینچ کے سامنے لگ جاتا ہے جس میں چیف جسٹس عمر عطا بندیال صاحب، جسٹس منصور علی شاہ صاحب اور جسٹس امین الدین خان شامل ہوتے ہیں۔ فریقین کو سننے کے بعد عدالت عظمیٰ اپنے فیصلے کا آغاز حاضری کے حوالے سے پشاور بورڈ کے قوانین سے کرتی ہے جس میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ بورڈ امتحانات دینے کے لئے طلباء کی ۶۶ فیصد حاضری لازمی ہے اور ریکارڈ کے مطابق مدعیہ کی حاضری ۴۵ فیصد ہوتی ہے۔ مدعیہ کا وکیل عدالت کے سامنے یہ بات رکھتا ہے کہ مدعیہ کی چونکہ اس وقت شادی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے مدعیہ سکول سے غیر حاضر رہتی ہے لیکن پھر بھی مدعیہ کی حاضری ۶۰ فیصد ہے اور اس بات وہ سکول ہذا کے پرنسپل کا ایک خط عدالت کے سامنے پیش کرتے ہیں لیکن پرنسپل جو کہ ایک تو متنازعہ ہوتی ہے اور دوسرا اس کی ریکارڈ سے کوئی طاقت نہیں ہوتی جس کے بعد مدعیہ کے وکیل عدالت سے ہمدردی، رحم اور انسانیت کی بنیاد پر فیصلہ سنانے کی درخواست کرتا ہے۔ ریکارڈ کا جائزہ لینے کے بعد عدالت عظمیٰ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ ایک تو مدعیہ پانچ نومبر کے بعد سکول سے غیر حاضر رہی ہوتی ہیں اور دوسرا یہ کہ بورڈ امتحانات کے لئے ۶۶ فیصد کا قانون بھی بڑا واضح ہے۔

عدالت عظمیٰ اپنے فیصلے کے آغاز میں ہی مختلف کیسز کا حوالہ دے کر یہ لکھتا ہے کہ تعلیمی اداروں کے انتظامی، نظم و ضبط اور پالیسی امور شعبہ تعلیم کے ماہر بندوں پر چھوڑتے ہوئے تب تک مداخلت نہیں کرتی جب تک کسی قانون یا بنیادی حقوق کی صریح خلاف ورزی نہ ہو اور اس کے عدالت عظمیٰ بڑے بہترین انداز میں مدعیہ کے وکیل کی جانب سے رحم اور ہمدردی کے بنیاد پر فیصلہ دینے کی بات کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمدردی کے بنیاد پر ریلیف تب ممکن ہوتی ہے جب متعلقہ قانون میں کوئی گنجائش موجود ہو اور جب گنجائش نہ ہو تو پھر عدالت قانون کی خلاف ورزی کر کے ہمدردی کی بنیاد پر ریلیف نہیں دے سکتی اور چونکہ بورڈ کا امتحان دینے کے لیے چھیاٹھ فیصد حاضری کا قانون بڑا واضح ہے تو اس لئے کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی تو اس لئے کسی بھی عدالت کے پاس یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ مدعیہ کو ریلیف دے سکے اور یوں مدعیہ کی درخواست خارج کر دی جاتی ہے۔

¹ یہ اہم فیصلہ جسٹس منصور علی شاہ نے تحریر کیا ہے۔ 2022 سپریم کورٹ آف پاکستان 293

² ایڈووکیٹ ویسٹچ آفیسر پشاور بار ایسوسی ایشن۔

پہلی سماعت پہ ہی دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنے کے حوالے عدالت عظمیٰ کا بہت اہم فیصلہ³

سجاد حمید یوسفی

تمہید:

عمومی پریکٹس یہ ہے کہ دیوانی مقدمات میں ہماری ماتحت عدالتیں پانچ پانچ سال لگاتی ہیں اور جب کیس عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ تک پہنچتا ہے تو اس میں کئی عشرے بیت جاتے ہیں۔ اس فیصلے کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس نے ضابطہ دیوانی میں موجود اس میکازم کو اپنانے پہ زور دیا ہے جس کے تحت مخصوص کمیہ مز میں پہلی ہی سماعت پہ کیس کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے جس میں نہ تو فریقین کی شہادت ہوتی ہے اور نہ ہی ان پہ جرح کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اس میکازم کے ہوتے ہوئے بھی ہماری عدالتیں نہ صرف شہادت ریکارڈ کرتی ہیں بلکہ جرح تک چلی جاتی ہیں اور یوں چند مہینوں کا کیس کئی سالوں پہ محیط ہو جاتا ہے۔

فیصلے کے حقائق:

۱۹۸۹ میں محمد عارف نامی شخص خانپور کے ڈپٹی کمشنر کو تحقیقات کے لیے ایک خط لکھتا ہے کہ حکومت کی ملکیتی زمین جس کا کل رقبہ ۹۷-۱۵ اکنال ہے کی تحقیقات کی جائیں، کیوں کہ یہ زمین نوشیر نامی اور علی شیر نامی اشخاص نے دھوکہ دہی سے پہلے ایک ایسے شخص (مراولہ موٹری) کے نام منتقل کی جو کہ مرچکا تھا اور بعد میں اپنے ناموں پہ منتقل کی۔ یہ فراڈ ہے اور حکومتی زمین کو فراڈ کے ساتھ ہتھیایا گیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے متعلقہ آفیسر سے اس کی تحقیقات کروائیں تو پتہ چلا کہ مذکورہ زمین نوشیر اور اس کے ساتھی نے جس شخص کے نام کروائی تھی اور پھر اپنے نام کروائی وہ شخص تین سال پہلے ہی ۱۹۷۱ میں فوت ہو چکا تھا جب کہ یہ زمین اس کے نام ۱۹۷۴ کو کی گئی۔ یہ رپورٹ ڈپٹی کمشنر کو بھیجی گئی اور بعد ازاں اسی رپورٹ کو ڈپٹی کمشنر نے بورڈ آف ریویو کے سینئر آفسر کو بھیجی۔ اسی بورڈ نے اس معاملے کو دیکھا اور تمام فریقین کو بلایا اور ان کے سامنے یہ سوال رکھا کہ جو تنازعہ انتقال ہوا ہے اس کو کیوں کینسل نہ کیا جائے؟

اس دور ان یہ بھی معلوم پڑا کہ جس شخص کے نام کو استعمال کیا گیا ہے نہ صرف یہ کہ وہ تین سال قبل مرچکا ہے بلکہ ان کے وارثین نے توتر کے کی زمین بھی اپنے نام کروائی ہے اور وہ بھی ۱۹۷۴ سے قبل کروائی ہے۔ گویا جس سال نوشیر اور اس کے ساتھی نے مراد کے نام زمین کا انتقال کیا وہ تین سال قبل نہ صرف مرچکا تھا بلکہ اس کی جائیداد بچوں نے اگلے ہی سال اپنے نام بھی کروائی تھی۔ انہیں حقائق نے نوشیر اور اس کے ساتھی کے کیس کو زمین بوس کر دیا۔ تمام فریقین کو سننے کے بعد بورڈ نے یہ فیصلہ دیا کہ مذکورہ انتقال غلط کیا گیا ہے اور اسے کینسل کیا جاتا ہے۔

اس حکم کے خلاف نوشیر دیوانی عدالت چلا گیا اور دیوانی عدالت نے دعویٰ، جواب دعویٰ کے بعد فریقین کی شہادت ریکارڈ کی اور باقاعدہ ٹرائل کیا۔ جس کی بلکل بھی ضرورت نہ تھی۔ ٹرائل کے بعد عدالت نے بورڈ کا فیصلہ کا عدم قرار دیا اور فیصلہ دیا کہ مراد نامی شخص تو زندہ تھا۔ بورڈ نے اس کے خلاف ڈسٹرکٹ کورٹ میں اپیل کی اور اپیل میں بھی ڈسٹرکٹ کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا گیا۔ اس کے بعد بورڈ نے لاہور عدالت عالیہ میں نظر ثانی کی درخواست جمع کی اور لاہور عدالت عالیہ نے ماتحت دونوں عدالتوں کے فیصلوں کو کالعدم قرار دیا اور بورڈ کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ نوشیر اور اس کا ساتھی عدالت عظمیٰ میں اس فیصلے کے خلاف گئے اور عدالت عظمیٰ کی ججمنٹ اسی کیس میں دی گئی ہے۔

عدالت عظمیٰ نے کہا کہ مجموعہ ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۱۲ سے لے کر آرڈر ۱۵ تک ایک پورا طریقہ کار موجود ہے جس کے تحت عدالت باقاعدہ ٹرائل میں جائے بغیر پہلی ہی سماعت پہ متعلقہ ریکارڈ کو دیکھ کر فیصلہ دے سکتی ہے، اگر ٹرائل کی ضرورت محسوس ناہو۔ اگر پورا کیس کسی ریکارڈ پہ منحصر ہے تو اس ریکارڈ کو منگوا یا جائے اور اس ریکارڈ کو دیکھ کر عدالت ٹرائل میں وقت ضائع کیے بغیر پہلی سماعت پہ ہی فیصلہ سنا دے۔ اسی مقام پہ معزز جج نے اس پورے طریقہ کار کو خوب واضح کیا ہے۔ اس تفصیل میں جانا صحیح نہ ہوگا۔ جسے فیصلے سے اسے اچھے سے پڑھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔

عدالت نے اس کے علاوہ بہت ہی اہم نکتے پہ بھی مختصر بحث کی ہے اور وہ بحث بہت ہی اہم ہے۔ وہ یہ کہ ضابطہ دیوانی کے دفعہ ۹ اور آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت حاصل ہونے والی دونوں دائرہ کار [کنکرنٹ] ہیں اور ایک ہی ہیں۔ اگر کسی انتظامی اتھارٹی نے کسی شخص کو قانون کے مطابق ذیل نہیں کیا تو آئین کے آرٹیکل ۲ کے تحت اسے دائرہ کار حاصل

³ Judgement of Honorable Justice Yahya Afridi, Civil Appeal no 1011/2016 and Judgement of Sardar Ijaz judge Islamabad High Court, writ petition no 3159/2020.

⁴ ایڈووکیٹ، عدالت عالیہ

ہے کہ اسے قانون کے مطابق ڈیل کیا جائے اور اس کے لیے وہ شخص عدالت عالیہ جاسکتا ہے اور دفعہ ۹ ضابطہ دیوانی کے تحت بھی اسے دادرسی حاصل ہے کہ اسے قانون کے مطابق ڈیل کیا جائے اور وہ اس کے لیے دیوانی عدالت جاسکتا ہے مگر وہ بیک وقت ایک ہی دائرہ کار والے فورم پر جاسکتا ہے دو فورم پر نہیں جاسکتا۔ یہاں پر بہت سے سوالات اٹھتے ہیں کہ آخر دو دائرہ کار کے فورمز کیسے ایک ساتھ وجود رکھ سکتے ہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فریقین کو دائرہ کار طے کرنے کا اختیار ہوگا کہ کس عدالت میں جایا جائے؟ اس کی تو قانون میں کوئی اجازت نہیں ہے۔ اس نکتے پر ضرور بحث ہونی چاہیے اور اس کی وضاحت ضروری ہے۔ جہاں اس اہم نکتے پر عدالت نے بات کی ہے وہاں یہ کچھ وجوہات کا ذکر بھی ملتا ہے جن کی بنیاد پر کسی انتظامی اتھارٹی کے احکامات کو دیوانی عدالت کا عدم کر سکتی ہے۔ اور دیوانی عدالت کو صرف انہی وجوہات تک ہی محدود رہنا پڑے گا۔ وہ وجوہات اگر کسی انتظامی اتھارٹی کے حکم میں پائے جائے تو دیوانی عدالت یہ کیس ریماڈ کرے گی۔ ان وجوہات کا ذکر فیصلے میں موجود ہیں۔

مزید یہ اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوانی عدالت نے کسی انتظامی اتھارٹی کا حکم اگر پرکھنا ہے تو دیوانی عدالت صرف قانونی نکات اور سوالات کی حد تک محدود رہے گی اور میرٹ یا کیس کے حقائق پر نہیں جائے گی بلکہ مدعی کے اس حق کو نافذ کرنے کا حکم صادر کرے گی کہ اسے قانون کے مطابق ڈیل کیا جائے۔ یعنی جیسے عدالت عالیہ کرتی ہے کہ حقائق میں جائے بغیر ہی مقدمے کو قانونی سوالات کے بنیاد پر پرکھتی ہے۔ دیکھا جائے تو عدالت عظمیٰ نے اس ججمنٹ میں دیوانی عدالت کو دفعہ ۹ کے تحت حاصل ہونے والے اختیارات کو آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت عدالت عالیہ کو حاصل ہونے والے اختیارات کی طرح دیکھا ہے اور ڈیل کیا ہے۔ جس طرح عدالت عالیہ دستوری حقوق کا محافظ ہے اور کسی بھی اتھارٹی کے حکم میں اگر کسی شخص کا دستوری حق مارا گیا ہو تو عدالت عالیہ اس اتھارٹی کو ہدایات جاری کر سکتی ہے کہ مدعی یا درخواست گزار کو قانون کے مطابق نمٹایا جائے۔ اسی طرح عدالت عظمیٰ کی یہ ججمنٹ کہتی ہے دیوانی عدالت بھی کسی انتظامی اتھارٹی کو ایسے ہی ہدایات اور احکامات جاری کر سکتی ہے۔

عدالت عظمیٰ نے لاہور عدالت عالیہ کا فیصلہ برقرار رکھا جس میں ریویونیو بورڈ کے فیصلے کو صحیح قرار دیا گیا تھا اور زمین واپسی کا حکم دی گیا تھا۔ یہ فیصلہ بہت ہی اہم ہیں۔ اسی نوعیت کا فیصلہ سردار اعجاز اسحاق صاحب جسٹس اسلام آباد عدالت عالیہ بھی دے چکے ہیں اور وہ بھی انتہائی اہمیت کا حامل فیصلہ ہے۔ دونوں فیصلوں کو پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ خاص کر ہماری دیوانی عدالتوں کو چاہیے کہ ان فیصلوں پر انحصار کرتے ہوئے پہلی ہی سماعت میں دیوانی مقدمات کا فیصلہ سنائیں جن میں قانون نے ایسا کرنے کو ضروری قرار دیا ہے اور جن مقدمات میں ٹرائل میں جانا ایک بے مقصد عمل ہو۔

توہین عدالت کے متعلق عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ

محمد اسد

حقوق:

تحریک انصاف کے چیئر مین عمران خان نے ۱۲۶ اگست ۲۰۱۳ کو ایک پریس کانفرنس میں عدلیہ کے متعلق بات کرتے ہوئے لفظ "شرمناک" استعمال کیا، جس پر رجسٹرار عدالت عظمیٰ نے ایک تفصیلی نوٹ بمعہ مذکورہ بیان کے اخباری اشتہاروں کے چیف جسٹس آف پاکستان کو بھیجا۔ جس پر چیف جسٹس صاحب نے ۱۳ اگست ۲۰۱۳ کو آرڈر جاری کیا کہ عمران خان ۲ ستمبر ۲۰۱۳ کو عدالت کے روبرو پیش ہو کر یہ وضاحت کرے کہ اس کے خلاف آئین کے آرٹیکل ۱۲۰۷ اور توہین عدالت آرڈیننس ۲۰۰۳ کے تحت توہین عدالت کی کاروائی کیوں نہ شروع کی جائے۔

عمران خان مقررہ دن پر اپنے وکیل سینئر ایڈوکیٹ عدالت عظمیٰ حامد خان کے ساتھ عدالت کے روبرو پیش ہوئے اور دو وضاحتی جوابات عدالت میں جمع کروائے، جس میں عدالت سے معذرت کے بجائے یہ موقف لیا گیا کہ عمران خان اور اسکی پارٹی عدالتوں کا احترام کرتی ہے اور ان سے انصاف کی توقع رکھنے سمیت انکی بحالی اور آزادی کیلئے جدوجہد کرتی آئی ہے اور یہ بات وکلاء تحریک میں عمران خان اور اسکی پارٹی کی شمولیت اور ایکشن کمیشن اور اسکے اہلکاروں سے متعلق اپنی شکایات کی تلافی کیلئے عدالتوں سے رجوع کرنے

⁵ یہ اہم فیصلہ جسٹس ظہیر انور جمالی نے لکھا ہے اور اسے پی۔ ایل۔ ڈی۔ ۲۰۱۳ عدالت عظمیٰ ۳۶۷ کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

⁶ طالب علم شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

⁷ Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, art. 204

⁸ Contempt Of Court Ordinance, 2003

سے واضح ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ مذکورہ لفظ اعلیٰ عدلیہ کے بجائے ماتحت عدلیہ کے ان اہلکاروں، جنہوں نے سن ۲۰۱۳ء کیلکشن میں ریٹرننگ افسران⁹ کے طور پر ڈیوٹی سرانجام دی، کے متعلق تھا۔ یہ دونوں وضاحتی بیانات عدالت کی طرف سے مسترد ہونے کے بعد ایک تیسرا تفصیلی جواب داخل کرایا گیا جس میں مندرجہ بالا دلائل کے ساتھ ساتھ ایڈووکیٹ حامد خان نے یہ دعویٰ کیا کہ مذکورہ لفظ اول تو غلط رپورٹ ہو اور اگر یہ لفظ اس کے مؤکل نے استعمال بھی کیا ہو، تو اس کو سیاق و سباق سے ہٹ کر محض ایک معنی کے تناظر میں نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ روزمرہ استعمال اور ڈکشنری میں لفظ "شرمناک" کے کئی معانی درج ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان مخصوص حالات و وجوہات کا ذکر بھی کیا جس کی وجہ سے عمران خان نے پریس کانفرنس کی اور مذکورہ لفظ استعمال کیا، جس میں ریٹرننگ افسران پر ۲۰۱۳ء کیلکشن میں ڈیوٹی سے مسیدہ غفلت سمیت دھاندلی میں سہولت کاری کرنا اور قومی عدالتی پالیسی ساز کمیٹی کا ریٹرننگ افسران کے کردار کو سراہنے اور الیکشن امیدواروں کے آدھے سے زیادہ شکایات کو بے بنیاد اور مضحکہ خیز قرار دینے، عدالت کا مسیدہ دھاندلی پر سو موٹو نہ لینے اور عدالت کا مسلم لیگ ن کی درخواست پر صدارتی انتخابات کی تاریخ بنا کر تحریک انصاف کو سنے تبدیل کرنے جیسے اقدامات سے عمران خان کو بچنے والے دکھ جیسی وجوہات کو مذکورہ لفظ استعمال کرنے کیلئے بطور جواز پیش کیا گیا۔

قانونی طور پر ایڈووکیٹ حامد خان نے توہین عدالت ایکٹ¹⁰ کے دفعہ ۳ کی ذیلی دفعہ الف اور ب کا سہارا لیا جس میں کسی عدالت کے کام کرنے کے طریقہ کار اور اسکے فیصلے پر اچھی نیت اور الفاظ کے ساتھ، مفاد عامہ کی خاطر کیے گئے تبصرہ کو تحفظ دیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ حامد خان نے تین عدالتی فیصلوں¹¹ کی بنیاد پر یہ مؤقف اختیار کیا کہ عدالتیں توہین عدالت کے کیسز میں جہاں توہین، عدالتی حکم کی نافرمانی کے بجائے کسی نامناسب لفظ کے استعمال کی وجہ سے واقع ہوئی ہو، ان کیسز میں عدالتیں نرم رویہ اختیار کرنے سمیت ضبط کا مظاہرہ کرتی ہیں اور یہی رائے انارنی جزل منیر اے۔ ملک کی بھی تھی اور دونوں وکلاء نے اس بنیاد پر عدالت سے نرمی اختیار کرنے اور شوکاز نوٹس کو واپس لینے کی استدعا کی۔ اس کے علاوہ عمران خان نے روسٹرم پر مذکورہ لفظ کو "نامناسب/نامعقول" کے معانی میں استعمال کرنے کا مؤقف لیا۔

ان عدالتی فیصلوں اور اسلام میں معاف کرنے کی فضیلت اور قاضی کے لیے طے شدہ اخلاقی معیارات، جس میں ٹھنڈا مزاج، اچھی نیت سے کی گئی تنقید چاہے سخت الفاظ میں کیوں نہ ہو، کو سہنے، بڑاپن دکھانے اور توہین عدالت و قاضی کے ملزم سے غیر مشروط معافی مانگنے پر اصرار نہ کرنے جیسی صفات، اور عمران خان کی اوپر بیان کی گئی شکایات کی کسی حد تک درستگی، دوران ٹرائل عمران خان کا اچھا رویہ، مناسب وضاحتی جوابات، بروقت حاضری، توہین عدالت کے کیسز میں غیر مشروط معافی مانگنے کے عمل کا غیر لازم ہونے اور آئین کے آرٹیکل ۱۹ اور ۶۶ کے تحت پارلیمنٹ کے ایک ممبر کو حاصل آزادی رائے کا حق، جیسی وجوہات کی بنیاد پر عدالت نے مستقبل میں نامناسب الفاظ استعمال نہ کرنے کی انتہاء کی اور غیر مشروط معافی طلب کرنے پر مزید اصرار ترک کر کے شوکاز نوٹس کو نمٹا دیا۔

غیر ملکی ثالث کے فیصلے کو پاکستان میں نافذ کرنے پہ لاہور عدالت عالیہ کا فیصلہ

مدثر اقبال

کیس کے حقائق:

درخواست گزار کی طرف سے عدالت کے سامنے ایک درخواست پیش کی گئی کہ غیر ملکی ثالثی ایوارڈ کو پاکستان میں نافذ العمل کیا جائے۔ دو کمپنیوں "ترڈھول" (بین الاقوامی کمپنی) اور "شکر گنج" (لوکل کمپنی) نے ایک کاروباری معاہدہ کیا تھا جو کہ [ہتھنوں] کی تجارت کے حوالے سے تھا۔ دونوں کمپنیوں کے درمیان تجارت کے حوالے سے ایک

⁹ **Returning Officer:** The official in each constituency or electorate who conducts an election and announces the result.

¹⁰ Contempt of Court Act, 1976

¹¹ PLD 1998 SC 923, PLD 2012 SC 823, PLD 2013 SC 413

¹² Foreign Arbitral Award.

¹³ Title of the case is *M/s Tradhol International SA Sociedad Unipersonal V/S M/s Shakar Ganj Limited* and can be searched as Civil Original Suit No.80492 of 2017.

¹⁴ Student of LLB, (7th Semester), International Islamic University Islamabad.

معادہ طے ہوا اور ساتھ میں یہ بھی طے ہوا کہ تنازعہ کے صورت میں دونوں کمپنیاں لندن کورٹ آف انٹرنیشنل اریبیٹیشن¹⁵ کے اصولوں کے تحت ایک ایک ثالث مقرر کرے گی اور پھر مقرر شدہ دونوں ثالث ایک تیسرے ثالث کی تقرر کرے گی جو تنازعے کو حل کرے گی۔ "شکرگنج" کی طرف سے معادہ کے ذمہ داریوں کی عدم ادائیگی کی صورت میں "ٹراڈھول" نے "شکرگنج" کے خلاف لندن کورٹ آف انٹرنیشنل اریبیٹیشن میں درخواست دائر کی جس کے نتیجے میں ثالث مقرر کیے گئے۔ تاہم، "شکرگنج" نے وقت کی توسیع کی درخواست دائر کی اور ساتھ میں سول کورٹ لاہور میں لندن کورٹ آف انٹرنیشنل اریبیٹیشن کے دائرہ اختیار کو چیلنج کیا اور ساتھ میں ثالثی کی کارروائی میں بیٹھنے سے انکار کیا۔ ثالثی ٹریبونل نے اپنی کارروائی کو جاری رکھتے ہوئے اپنے دائرہ کار پر فیصلہ دیا اور ساتھ میں "تھرڈول" کے دعویٰ کو درست قرار دیتے ہوئے، "شکرگنج" پر جرمانہ اور معادہ کی رقم ادا کرنے کا حتمی فیصلہ سنا دیا۔ جس کو فائنل ایوارڈ کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ، "شکرگنج" کو سول کورٹ لاہور میں جاری قانونی کارروائی کو ختم کرنے کا بھی حکم صادر کیا۔

لاہور عدالت عالیہ میں "ٹراڈھول" نے لندن کورٹ آف انٹرنیشنل اریبیٹیشن کے فائنل ایوارڈ کو نافذ کرنے کیلئے درخواست دائر کر دی۔ اس درخواست پر "شکرگنج" نے جو اعتراضات اٹھائے وہ درج ذیل ہیں۔ اعتراض یہ تھا کہ یہ معادہ دوسرے سے نافذ العمل ہی نہیں ہوا اور نہ ہی اس معادے کو کمپینٹ اتھارٹی کی طرف سے دستخط کیا گیا۔ ساتھ میں اس معادے کو پاکستان کے "آئین" کے خلاف قرار دیا۔

لاہور عدالت عالیہ نے دونوں کمپنیوں کے اعتراضات اور جوابات کو سنتے ہوئے اپنے سامنے ۵ سوالات رکھے۔

1. آیا عدالت عالیہ کے پاس غیر ملکی ثالثی ایوارڈ کو نافذ کرنے کا اختیار ہے؟
2. کیا مدعی، "ٹراڈھول" نے [شناخت اور نفاذ (ثالثی) کے معادے اور غیر ملکی ثالثی ایوارڈز] ایکٹ، ۲۰۱۱ء¹⁶ کے دفعہ ۵ کے تحت سارے دستاویزات پیش کیے ہیں؟
3. کیا یہ فائنل ایوارڈ ناقابل نافذ العمل ہے کیونکہ یہ معادہ باطل ہے؟
4. کیا یہ فائنل ایوارڈ ناقابل نافذ ہے کیونکہ یہ پاکستان کے عوامی مفاد کے خلاف ہے؟
5. کیا پری۔ تفسیر پالیسی کا نظریہ پاکستان عدالتوں میں لاگو ہوتا ہے یا نہیں؟

عدالت عالیہ لاہور نے پانچوں سوالوں کا تفصیلی جائزہ لے کر اس پر روشنی ڈالی ہے۔ ہر ایک سال کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلے سوال کے جواب میں عدالت نے "قانون" ¹⁷ کے دفعہ ۳ کا جائزہ لے کر کہا کہ عدالت عالیہ کے پاس خصوصی دائرہ اختیار ہے کیونکہ "قانون" کے دفعہ ۵ (ڈی) میں واضح لکھا ہوا ہے کہ عدالت سے مراد عدالت عالیہ اور دوسرے عالی عدالتیں ہیں۔ اور یہ بھی کہا کہ سول کورٹ لاہور کے پاس اس کا دائرہ اختیار نہیں ہے صرف عدالت عالیہ کے پاس ہے۔

دوسرے سوال کے جواب کے لیے عدالت نے "قانون" کے دفعہ ۵ کا جائزہ لیا جو کہ دستاویزات کے حوالے سے ہے۔ عدالت نے "شکرگنج" کے وکیل کو دستاویزات کے فراہمی کے حوالے سے سوال کیا، جواب میں اس نے بتایا کہ اس نے کوئی دستاویز جمع نہیں کرائی۔ "ٹراڈھول" کے وکیل نے دفعہ ۵ کے تحت تمام دستاویزات جمع کرائے تھے۔ اس پر عدالت نے "ٹراڈھول" کی دستاویزات اور درخواست کو تسلی کو بخش قرار دے کر کارروائی آگے بڑھادی۔

تیسرے سوال پر آتے ہوئے عدالت نے "قانون" کے دفعہ ۷ اور [نیویارک کنونشن]¹⁸ کے دفعہ ۵ کو ریفر کیا جس میں یہ لکھا ہے کہ ایوارڈ کو صرف اس صورت میں نافذ العمل قرار دیا جائے گا، اگر وہ معادہ جس پر یہ ایوارڈ آیا ہو وہ معادہ باطل ہو یا نااہلی ہو۔ عدالت نے کہا ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری "شکرگنج" پر ہے کہ وہ ثابت کرے کہ یہ معادہ غلط ہے یا فریقین کی نااہلی پر مبنی ہے، جو کہ ناکام رہی، اور ٹراڈھول کو معادے کی درستگی ثابت کرنے کا کہا۔ ساتھ میں دونوں فریقین کی بات چیت پر تفصیلی نظر ڈالی جو میل کے ذریعے کی گئی تھی۔ عدالت نے دلائل کو سنا اور یہ فیصلہ دیا کہ معادہ "قانون" کے مطابق ہے اور "شکرگنج" کے اعتراض کو خارج کرتے ہوئے کہا کہ جس فرد نے "شکرگنج" کی طرف سے معادہ پر دستخط کئے اس کے پاس دستخط کرنے کا اختیار موجود تھا۔

¹⁵ London Court of International Arbitration.

¹⁶ Recognition and Enforcement (Arbitration Agreements and Foreign Arbitral Awards) Act, 2011.

¹⁷ Recognition and Enforcement (Arbitration Agreements and Foreign Arbitral Awards) Act, 2011.

¹⁸ New York Convention on the recognition and Enforcement of foreign Arbitral Awards, 1958.

چوتھے سوال پر عدالت نے (نیویارک کنونشن) کے دفعہ ۵(۲) (ب) کو ریفر کیا جس میں یہ لکھا گیا ہے کہ ثالثی ایوارڈ کو اس صورت نافذ نہیں کیا جاسکتا جب یہ اس ملک کے عوامی مفاد کے خلاف ہو۔ اس کے جواب میں عدالت نے عدالت عظمیٰ، امریکی عدالتوں اور برٹش عدالتوں کے مختلف فیصلوں کو ریفر کیا اور کہا کہ دنیا کے زیادہ تر عدالتوں نے بین الاقوامی تجارت میں اس عوامی مفاد کے نقطہ نظر کو ایک محدود زاویے سے دیکھا جاتا ہے۔ عدالت نے کہا کہ عالمی تجارتی معاہدوں کی سالمیت کو برقرار رکھنا انتہائی ضروری ہے اور اگر ہم عوامی مفاد کے اس مضحکہ خیز تصور کو برقرار رکھیں گے تو یہ سالمیت برقرار نہیں رہ سکتی۔ عدالت نے مزید اس اعتراض کو بے بنیاد قرار دے کر کہا کہ اس ایوارڈ پاکستان کے "قانون" اور عوامی مفاد کی خلاف ورزی نہیں ہوئی ہے۔

پانچویں سوال پر آتے ہوئے عدالت نے (پری انفورسمنٹ پالیسی) 19 پر روشنی ڈالی۔ عدالت نے کہا کہ پاکستان (نیویارک کنونشن) کا دستخط کنندہ ہے اور اس نے اس پالیسی کو تسلیم کیا ہے اور ساتھ میں اس کے لیے ۲۰۱۱ میں "قانون" سازی بھی کی ہے۔ جس کی دفعہ ۲(ا) اس (پری انفورسمنٹ پالیسی) 20 کے بارے میں کہتی ہے۔ عدالت نے عدالت عظمیٰ کے مختلف فیصلوں کو ریفر کیا جس میں عدالت نے پری انفورسمنٹ پالیسی کو مانا ہے۔ اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ یہ عدالتوں کی ذمہ داری ہے کہ ثالثی معاہدہ کی تقدس کا خیال کرے اور سرمایہ کاروں کی حفاظت کرے۔

عدالت نے کہا کہ "شکر گنج" اپنے اعتراضات ثابت کرنے میں ناکام رہی۔ آخر میں عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ عدالت غیر ملکی ثالثی ایوارڈ کو اس طرح نافذ کرے گی جس طرح پاکستان میں عدالت کے فیصلے کو کیا جاتا ہے اور یہ کہا کہ فائل ایوارڈ کو نافذ کرنے کے لئے تمام لوازمات موجود ہیں۔

پہرا اوشکایات کی کونسل کے دائرہ اختیار سے متعلق عدالت عظمیٰ کا اہم فیصلہ²⁰

علیشبا انجم²⁴

یہ کیس درج ذیل سوالات کے جوابات کے لئے عدالت عظمیٰ میں پیش ہوا۔

1. کیا پیمر آرڈیننس کے دفعہ ۲۷(ا) {اے} ایک خود مختار سیکشن ہے یا اس کے نفاذ کے لیے دفعہ ۲۶ کے تحت شکایات کی کونسل کی رائے درکار ہے؟

2. کیا پیمر، شکایات کی کونسل سے رائے لیے بغیر کسی چینل کے خلاف ایکشن لے سکتا ہے یا اس کی نشریات بند کر سکتا ہے؟

کیس کے مختصر حقائق کچھ یوں ہیں کہ اے آر وائی کمیونیکیشنز، مزی پرائیویٹ لمیٹڈ نے ایک ڈرامہ سیریل "جلن" اپنے ٹی وی چینل، اے آر وائی ڈیجیٹل پر نشر کیا۔ کچھ افراد کی جانب سے پاکستان سٹیژن پورٹل پر شکایات کی گئیں کہ کہانی ڈرامہ سیریل غیر اخلاقی اور سماجی اور ثقافتی اقدار کے خلاف ہے اور شکایات چیئر مین پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی کو مناسب کارروائی کے لیے بھیج دی گئیں۔ پیمر نے اے آر وائی کو تبصرے جمع کروانے کے لیے کہا جس میں وہ الزامات کی تردید کر رہا ہے پیمر نے تبصروں سے غیر مطمئن ہو کر، پہلے دو ہدایات جاری کیں۔ اے آر وائی کو مزید اقساط نشر کرنے سے پہلے ڈرامہ سیریل کے اسکرپٹ میں ترمیم کرنے کے لیے کہا اور پیمر آرڈیننس کی شق ۲۷(اے) [اے] جو نشریات پر پابندی اور ڈرامہ سیریل کی دوبارہ نشریات سے متعلق ہے اس کے تحت آرڈر ۱۰ ستمبر ۲۰۲۰ کو جاری کیا۔ اے آر وائی نے آرڈر کے خلاف اپیل دائر کی۔ پیمر آرڈیننس کے دفعہ ۳۰ [اے] کے تحت سندھ عدالت عالیہ سے رجوع کیا جس کی اجازت ۱۵ ستمبر ۲۰۲۰ کو دی گئی تھی اور یہ معاملہ پیمر اور کوریمینڈ کے لیے دیا گیا کہ وہ ایک مناسب وجہ بیان کرنے کے بعد ایک نئے سرے سے فیصلہ کرے اور ڈرامے کے قابل اعتراض مواد کی وضاحت کرتے ہوئے اے آر وائی کو نوٹس جاری کریں اور سماعت کا موقع فراہم کریں۔ سندھ عدالت عالیہ نے معاونت کے حکم کو کالعدم قرار دیا۔ پیمر نے سندھ عدالت عالیہ کے فیصلے کے خلاف عدالت عظمیٰ سے رجوع کیا۔

19 معاہدہ کرنے والی ریاست ثالثی ایوارڈ کو نافذ کرنے کی پابند ہوگی۔

20 Pre-enforcement policy.

21 Pakistan Electronic Media Regulatory Authority

22 Council of Complaint

23 Case citation: Civil petition No 3506 of 2020

24 بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبہ قانون کے تیسرے سمسٹر کی طالبہ ہے۔

عدالت عالیہ کی ہدایت کے مطابق پیمرانے دو وجوہات بیان کی کہ مذکورہ ڈرامہ سیریل کی کہانی / تھیم جو مذہبی احکام قرآن پاک میں درج ہیں ان کے مطابق نہیں ہے اور ملک کی سماجی / ثقافتی / اقدار جن میں بہنوئی اور سالی کے درمیان تعلقات کے تقدس سے سمجھوتہ کرنے والا مواد ہے جو انتہائی قابل اعتراض ہے اور مزید کے یہ ڈرامہ سیریل معاشرے کے نوجوان طبقے کو اکسانے کی مہلک کوشش ہے۔ اے آر وائی نے موقف اختیار کیا کہ ڈرامہ سیریل "جلن" میں کوئی قابل اعتراض مواد نہیں ہے جس سے کسی بھی ناظرین کے جذبات مجروح ہوں یا کسی بھی سماجی، اخلاقی، مذہبی یا ثقافتی اصول کی خلاف ورزی کر رہا ہو۔ واضح طور پر عرض ہے کہ یہ صرف ایک کہانی کو پیش کرتی ہے جو سماجی مسئلہ پر مبنی ہے اور اس طرح کے منفی نتائج کو مزید ہائی لائٹ کرتا ہے اور پیمر کسی بھی خاص خلاف ورزی کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہا۔ اے آر وائی نے اس حوالے سے اعتراض اٹھایا کہ پیمر آرڈیننس کے دفعہ ۲۶ کے تحت کیا پیمر کے پاس یہ دائرہ اختیار ہے کہ وہ بغیر شکایات کی کونسل کی رائے کے شوکاژ نوٹس جاری کر سکتا ہے یا نہیں۔ فریقین کی بات سننے کے بعد عدالت نے اپنے فیصلے کا آغاز اس نقطے سے کیا کہ سب سے پہلے، ہم اسے تصور کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ قانون کے تحت پیمر جیسی ریگولیٹری اتھارٹی کے قیام کا فریم ورک پیمر آرڈیننس کے تحت اور آزادی اظہار اور معلومات کے بنیادی حقوق کو منظم کرنے کا فریم ورک جسکی ضمانت آئین کے آرٹیکل ۱۹ اور ۱۹ [اے] کے ذریعے دی گئی ہے۔

جو پیمر آرڈیننس کی تمہید²⁵ کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ پیمر کا مقصد معلومات کے معیار کو بہتر بنانا اور ریگولیٹ کرنا ہے اور میڈیا نشریات کے ذریعے عوام تک پھیلا نا۔ آئینی سیاق و سباق²⁶ کے مطابق پیمر کا کام تحفظ کو بڑھانا ہے اور میڈیا کے مواد کو ریگولیٹ کر کے اظہار رائے کی آزادی کو منظم کرنا ہے۔ میڈیا بروڈکاسٹ ڈراموں کی شکل میں نشر ہوتا ہے جو اجتماعی طور پر معاشرے کی تشکیل، عوام کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے عوامی رائے اور ثقافتی ترقی کو فروغ دیتا ہے۔ معلومات کا حق آئین کے آرٹیکل ۱۹ [اے] بلکہ معلومات تک رسائی کے ایکٹ ۲۰۱۷²⁷ کے تحت تصور کیا گیا ہے اس میں میڈیا مواد بھی شامل ہے جو بطور عوام تک پہنچایا گیا ہے جو "معلومات" کا لازمی حصہ ہے اگر ایک کو اظہار آزادی کا حق حاصل ہے تو دوسرے کو رسائی کا حق حاصل ہے کہ وہ معلومات حاصل کریں۔ دونوں بنیادی حقوق ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ آزادی اظہار (آرٹیکل ۱۹) کے تناظر میں خیالات، جذبات، عقائد کو پہنچانے کے عمل سے مراد ہے اور مواصلات کی مختلف شکلوں²⁸ کے ذریعے رائے کا اظہار بھی شامل ہے۔ اس میں شامل ہے، بولے گئے یا تحریری الفاظ، فنکارانہ کام، علامتی اقدامات۔ اظہار رائے کی آزادی ایک بنیادی انسانی حق ہے جو افراد کو کھل کر بات چیت کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ کے تحت صرف معلومات کی رسائی تک محدود نہیں ہے۔ معلومات دوسری طرف، عام طور پر ڈیٹا سے مراد ہے یا تھاقیق یا علم جو منظم ہو اور مختلف فارمیٹس میں بات چیت کی گئی جو لوگوں کو سمجھنے یا کسی خاص موضوع یا مسئلے کے بارے میں فیصلے لینے میں مددگار ہو۔ پیمر کی جانب سے یہ دلیل دی گئی ہے کہ دفعہ ۲۵ [۵] کے تحت شکایات کی کونسلز کے پاس کسی بھی پروگرام کی نشریات پر پابندی عائد کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے اور صرف کسی کارروائی کی مزمت یا جرمانے میں تجویز دے سکتا ہے۔ اور یہ دلیل دی گئی ہے، کہ دفعہ ۲۷ [اے] پیمر کو ایک آزاد اختیار دیتا ہے کہ وہ شکایات کی کونسل کی رائے حاصل کرنے اور اس پر غور کرنے پر منحصر نہیں ہے۔ جبکہ دفعہ ۲۶ کی ذیلی دفعہ (۲) اور ذیلی دفعہ (۵)۔ ذیلی دفعہ (۲) کے تحت شکایات کی کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ "پروگراموں کے کسی بھی پہلو کے خلاف شکایات" کا جائزہ لیں اور اپنی تجاویز پیش کرے یہ وہ طاقت ہے جو اسے ذیلی دفعہ (۵) سے الگ بناتی ہے، ذیلی دفعہ (۵) کسی بھی کارروائی کی مزمت یا جرمانے کی تجویز کرتا ہے۔ اور دفعہ ۲۶ [۲] کے مطابق کونسل افراد کی طرف سے کی گئی شکایات کو وصول کرے گی اور ان کا جائزہ لے گی۔ پیمر آرڈیننس کا دفعہ ۳۰ [۱] [بی] تنازعہ کی حمایت میں یہ کہتا ہے کہ مقتنہ نے واضح طور پر اس دفعہ میں کہا ہے کہ پیمر شکایات کی کونسل کی رائے حاصل کرنے اور اس پر غور کرنے کے بعد عمل کرے جبکہ دفعہ ۲۷ [اے] { یہ کہتا ہے کہ پیمر شکایات کی کونسلز کی رائے سے آزاد ہو کر کام کرے گا۔ اس نقطہ نظر میں عدالت یہ پتہ لگانے کی کوشش کرتی ہے کہ قانون کو بنانے کا مقصد کیا ہے اور اس کی انفرادی دفعات اس بڑے فریم ورک میں کیسے پوری بیٹھی ہیں۔ پیمر کی جانب سے یہ بھی دلیل دی گئی ہے کہ دفعہ ۲۶ [۲] کے تحت شکایات کی کونسل کے پاس کسی اشتہار کے خلاف شکایات وصول کرنے اور ان کا جائزہ لینے کا اختیار نہیں ہے جبکہ سیکشن ۲۷ [اے] کے تحت پیمر کے پاس اختیار ہے۔

دفعہ ۲۶ کی ذیلی دفعہ (۲) میں "اشتہار" کا ذکر نہیں ہے لیکن دفعہ ۲۶ کے ذیلی دفعہ (۵) میں ذکر کیا گیا ہے۔ دفعہ ۲۶ کو پورا پڑھنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقتنہ کا اس سیکشن کو بنانے کا بنیادی مقصد کیا ہے۔ دفعہ ۲۶ کی ذیلی دفعہ (۵) کی دفعات مقتنہ کے ارادے کو کافی حد تک واضح کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہے کہ شکایات کی کونسل کو پروگراموں یا اشتہارات کے کسی بھی پہلو کے خلاف شکایات کو وصول کرنے اور جائزہ لینے کا اختیار ہے۔ دو اہم بنیادی حقوق²⁹ کو منظم کرنے کے لیے اور عوامی جگہ پر نشر اور موصول ہونے والا میڈیا مواد

²⁵ Preamble of PEMRA Ordinance, 2002.

²⁶ Constitutional point of view

²⁷ Right of Access to Information Act, 2017

²⁸ Mode of Communication

²⁹ Freedom of Expression and Information.

پیہرا آرڈیننس کے دفعہ ۲ کے تحت دو سطحی ریگولیشن کے ذریعے ریگولیشن کیا جاتا ہے۔ پہلے آزاد عوامی ریگولیشن اداروں کے ذریعے جسے شکایات کی کونسل کہا جاتا ہے جو منتخب نامور شہریوں پر مشتمل ہے، دوسرا پیہرا کے ذریعے جو حکومت کے زیر کنٹرول ریگولیشن ادارہ ہے۔

ان دونوں اداروں کی بنیادی ذمہ داری اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ میڈیا مواد آرٹیکل ۱۹ اور ۱۰ [اے] کے تحت آئینی شکایت ہے یا نہیں۔ پیہرا کی طرف سے شکایات کا جائزہ لینے کے بعد اور پیہرا آرڈیننس کے دفعہ ۲۶ اور ۲۷ کو پڑھنے کے بعد یہ غور کیا گیا ہے کہ دفعہ ۲۷ ایک خود مختار پرویشن نہیں ہے اور پروگرام یا اشتہار کے قابل اعتراض پہلو پر اس پرویشن کے عمل درآمد کے لیے شکایات کی کونسل کی رائے کی ضرورت ہے۔ کمیونٹی میں عام طور پر قبول شدہ شائستگی کے معیار اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ یہ ڈرامہ "فحش" یا "جارحانہ" ³¹ ہے یا نہیں۔

"عوامی شائستگی" اور "عوامی اخلاقیات" کے مفاد کو محفوظ بنانے کے جائز مقصد جیسا کہ آئین کے آرٹیکل ۱۹ میں مذکور ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ لوگ کیا سوچتے ہیں کہ کیا نشر کرنے کے لیے ٹھیک ہے یا نہیں بلکہ عوامی شائستگی اور عوامی اخلاقیات کو نقصان پہنچانے کی بنیاد پر اس نشریات کو روکا جاسکتا ہے جسے لوگ برداشت نہیں کر سکتے۔

مازمر کا عدالتی کارروائی سے مسلسل غیر حاضر رہنے پر بلوچستان عدالت عالیہ کا ایک اہم فیصلہ ³²

عاقب فاروق ³³

اس درخواست میں فیصلہ کے مصنف جج جسٹس محمد کامران خان ملاخیل نے سوال اٹھایا کہ کیا ایسا شخص عدالت میں شنوائی کا حق رکھتا ہے جو مسلسل عدالت سے غیر حاضر رہا ہو۔ معاملہ کچھ یوں ہے کہ سردار خان صاحب اور ایک دوسرے صاحب (درخواست گزار) پر مجسٹریٹ فرسٹ کلاس (ضلع ہرنائی، بلوچستان) کی عدالت میں کول مائنز ریگولیشن ³⁴ کے دفعہ ۲۵، ۱۵، [۱]، ۱۱، ۱۰ اور ۷ کے خلاف ورزی پر استغاثہ دائر کیا گیا اور ٹرائل کورٹ کی جانب سے درخواست گزار کو پیشی کے سمن جاری کیے گئے لیکن درخواست گزار پیش نہ ہوئے۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ٹرائل کورٹس کے سمن ہوا میں اڑانے کا ایک عمومی رویہ پایا جاتا ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ عدلیہ پر کیسز کی غیر ضروری طوالت کا بوجھ ہیں۔ سمن جاری کرنے کا مقصد فریقین کی حاضری یقینی بنانا ہے تاکہ صاف اور شفاف ٹرائل ہو سکے۔ عدالت کے سمن کی تعمیل سے فریقین کے حقوق کا ہی تحفظ ہوتا ہے۔ خیر عدم پیشی پر عدالت نے درخواست گزار کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کیے اور حکم دیا کہ درخواست گزار کو عدالت میں پیش کیا جائے۔ ساتھ ہی اس ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری کی تعمیل نہ ہونے کی صورت میں متعلقہ نائب تحصیل دار کو ذاتی حیثیت میں پیش ہونے کا حکم دیا گیا۔ تاہم درخواست گزار سردار خان صاحب نے وارنٹ کی معطلی کی استدعا کی جسے عدالت نے قبول کیا۔

مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۵۷ [۲] ³⁵ کے تحت عدالت وارنٹ گرفتاری کو معطل کر سکتی ہے کیوں کہ وارنٹ کا مقصد ملزم کی عدالت میں پیشی ہے تاکہ عدالتی کارروائی قانون کے مطابق چل سکے۔ اس لیے عموماً عدالتیں ملزم کے پیش ہونے کی یقین دہانی پر وارنٹ گرفتاری معطل کر دیتی ہیں اور ہم بحیثیت مجموعی قانون میں فراہم کردہ آسانیوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں جو کہ نظام عدل کے لیے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ہمیں ان رویوں کو بدلنا ہے جو نظام عدل اور فراہمی انصاف کے لیے رکاوٹ ہیں۔ اوپر بیان کردہ آسانی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے درخواست گزار بھی عدالت سے مسلسل غیر حاضر رہے۔

³⁰ Obscene means offending against moral principles.

³¹ Vulgar means making explicit and offensive reference to sex or bodily functions; coarse and rude.

³² Case Citation: 2021 PCr.LJ 43.

³³ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں قانون کے چوتھے سمسٹر کا طالب علم ہے۔

³⁴ Coal Mines Regulations, 1926

³⁵ Section 75 clause 2 of the Code of Criminal Procedure, 1898.

یہاں مزید ایک قانونی نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری کے باوجود عدالت میں پیش نہیں ہوتا تو عدالت مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۸۷ کے تحت ایسے شخص کو اشتہاری قرار دے سکتی ہے اور دفعہ ۸۸ کے تحت اس کی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد قرق کرنے کا حکم بھی دے سکتی ہے۔ خیر ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۸ کو درخواست گزار کے وکیل ایک بار پھر وارنٹ معطلی کے سلسلہ میں پیش ہوئے اور ان کی استدعا قبول کر لی گئی۔

مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۲۵۹-اے کے تحت مجسٹریٹ کے پاس اختیار ہے کہ ملزمان (اس کیس میں درخواست گزار ملزم ہیں) کو دوران ٹرائل کسی بھی مرحلے پر بے گناہ سمجھتے ہوئے بری کر سکتا ہے۔ لہذا درخواست گزار نے اس سیکشن کے تحت بریت کے لیے درخواست دائر کی جسے مجسٹریٹ صاحب کی عدالت نے ۶ نومبر ۲۰۱۸ کو خارج کر دیا۔ سیشن کورٹ نے بھی اس درخواست کو ۲۲ نومبر ۲۰۱۸ کو مسترد کیا۔ ان فیصلوں سے ناخوش درخواست گزار نے یہ زیر بحث درخواست بلوچستان عدالت عالیہ میں دائر کی اور استدعا کی کہ درخواست گزار کو بری کیا جائے اور مجسٹریٹ صاحب کو مزید ٹرائل چلا کر اختیارات کے ناجائز استعمال سے روکا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔

عدالت عالیہ نے جب ٹرائل کورٹ کا ریکارڈ دیکھا تو معلوم ہوا کہ بارہا عدالت سے غیر حاضری پر ٹرائل کورٹ نے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کیے ہیں لیکن ہر بار درخواست گزار کے وکیل نے پیش ہو کر درخواست گزار کی پیشگی کی تلقین دہائی کروائی جبکہ ایسا نہ ہو سکا۔ زیر بحث سوال کا جواب دیتے ہوئے جسٹس محمد کامران خان ملاخیل نے تین اہم عدالتی نظائر³⁶ کا حوالہ دیا۔ ان تمام نظائر میں اعلیٰ عدلیہ نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ نظام عدل کی بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسا کوئی بھی شخص عدالت میں شنوائی کا حق نہ رکھتا ہے جو مسلسل عدالت سے غیر حاضر رہے، اس وقت تک جب وہ عدالت کے سامنے سرینڈر³⁷ نہ کر دے۔

جسٹس محمد کامران خان ملاخیل نے یہ کہتے ہوئے درخواست خارج کر دی کہ اگر مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۲۰۴ کے تحت جاری کردہ وارنٹ کی تعمیل کے بغیر یعنی درخواست گزار کے سرینڈر کے بغیر اس درخواست کو میرٹ پر قبول کر بھی لیا جائے تو یہ ٹرائل کورٹ کے عدالتی عمل کی توہین ہوگی کیوں کہ اگر کوئی شخص عدالت سے فرار حاصل کرے تو وہ اپنے کچھ عمومی حقوق کھو بیٹھتا ہے۔ اس عدالتی آرڈر میں واضح کیا گیا ہے کہ ٹرائل کورٹس کے عدالتی آرڈر کی توہین اور عدم حاضری سے کوئی بھی شخص اپنے عمومی حقوق کھو بیٹھتا ہے اور عدالت میں شنوائی کے لیے ایسے شخص کو سرینڈر کرنا پڑتا ہے۔

اعلیٰ عدالتوں کی جانب سے فیصلے محفوظ کر کے تاخیر سے سدنانہ کے بارے میں عدالت عظمیٰ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ³⁸

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ³⁹

کیس کے مختصر حقائق کچھ یوں ہیں۔

کمشنر ان لینڈ ریونیو بنام سوئی ناردرن گیس پائپ لائن لمیٹڈ کیس میں کمشنر ان لینڈ ریونیو کی جانب سے لاہور عدالت عالیہ کے چار ججس ریفرنسز کے فیصلوں کے خلاف عدالت عظمیٰ میں سول میٹیشن فار ریویو اپیل⁴⁰ جمع کی جاتی ہے۔ جس کی سماعت عدالت عظمیٰ کا تین رکنی بینچ جس میں جسٹس قاضی فائز عیسیٰ، جسٹس یحییٰ آفریدی اور جسٹس جمال مندوخیل صاحب کرتے ہیں لیکن سماعت کے دوران عدالت عظمیٰ کے نوٹس میں یہ بات لائی جاتی ہے کہ کمشنر ان لینڈ ریونیو کی جانب سے مندرجہ بالا مدعیان بالترتیب ایک سو بیالیس اور ایک سو تریالیس دنوں کی تاخیر سے جمع ہوئی ہیں جبکہ دوسری جانب مدعیان یعنی کمشنر ان لینڈ ریونیو کی جانب سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مندرجہ بالا تمام مدعیان اپنے مقررہ وقت یعنی ساٹھ دنوں کے اندر ہی عدالت عظمیٰ میں جمع ہوئی ہے۔

³⁶ 1999 SCMR 1619, PLD 2002 Lahore 74, 1999 PCr.LJ 1381.

³⁷ Surrender means to give oneself into the custody of the court or police at an appointed time and place.

³⁸ یہ اہم فیصلہ جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے لکھا ہے اور اسے پی۔ ایل۔ ڈی۔ ۲۰۲۳ عدالت عظمیٰ ۲۳۱ کے طور پر حوالہ دیا ہے

³⁹ ایڈووکیٹ وریسرچ آفیسر پشاور بار ایسوسی ایشن۔

⁴⁰ Civil Petition for leave to appeal.

مدعیان کے وکیل کی جانب سے عدالت کے سامنے یہ بات رکھی جاتی ہے کہ لاہور عدالت عالیہ کے جس فیصلے کے خلاف مدعیان نے عدالت عظمیٰ سے رجوع کیا ہے تو وہ فیصلہ ۱۸ نومبر ۲۰۲۱ کو چار ججس ریفرنسز کے کیس میں ساعت کے بعد عدالت عالیہ نے محفوظ کیا تھا یعنی ساعت کے بعد نہ تو فیصلہ لکھا گیا اور نہ ہی سنایا گیا۔ مدعیان کے وکیل کی جانب سے مزید کہا گیا کہ نہ تو فیصلے کے حوالے سے ہمیں کوئی نوٹس ملا اور نہ ہی فیصلے میں کوئی تفصیل درج ہے کہ یہ کب سنایا گیا اور کب لکھا گیا۔ مدعیان کے وکیل نے عدالت کے سامنے یہ بات بھی رکھی کہ ۲۸ نومبر ۲۰۲۱ کو ہم نے فیصلے کے نقول کے لئے درخواست دی تھی لیکن وہ اس وجہ سے واپس ہو گئی تھی کہ فیصلہ تب تک نہیں لکھا گیا تھا اور یہ کہ مدعیان کو فیصلوں کا پتہ ۲۴ مارچ ۲۰۲۲ کو چلا جب فیصلہ لاہور عدالت عالیہ کے ویب سائٹ پر اپلوڈ ہو گئے تھے جس کے بعد مدعیان نے فیصلے کے نقول کے لئے اپریل ۲۰۲۲ کو دوبارہ درخواست دی۔ مدعیان کی جانب سے ایک اور ثبوت یہ رکھا گیا کہ "بلوسلپ" کے مطابق فیصلے ۳۱ مارچ کو ہی سنائے گئے اور دستخط ہوئے ہیں۔

مدعیان کے وکیل کی جانب سے کیس کے حقائق کی وضاحت کے بعد مدعا لیکھم کے وکیل کی جانب سے یہ حقیقت تسلیم کی گئی کہ لاہور عدالت عالیہ کے فیصلوں پر صرف تاریخ سماعت ہی درج ہے اور فیصلے سنانے کے حوالے سے کوئی الگ تاریخ نہیں ہے لیکن ان کی جانب سے عدالت کو بتایا گیا کہ ارد گرد کے حالات واقعات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مدعیان کی جانب سے درخواست تاخیر کے ساتھ جمع کی گئی ہے۔

فریقین کی جانب سے دلائل مکمل ہونے کے بعد عدالت نے غور و خوض کے بعد یہ قرار دیا کہ چونکہ یہ ایک بات تو حقیقت ہے کہ یہ فیصلے تاریخ سماعت کے دن نہیں لکھے گئے اور فیصلے میں تاریخ سماعت کے علاوہ اور کوئی تاریخ درج نہیں ہے جس کے باعث یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ کیا یہ درخواست بروقت عدالت عظمیٰ میں جمع ہوئی ہے یا نہیں۔ یہاں تک تو یہ ایک عام سائیکس تھا لیکن اس کے بعد عدالت عظمیٰ نے اس امر کا جائزہ لیا ہے کہ ملک کی اعلیٰ عدالتوں میں ایک غلط روایت جنم لے رہی ہے کہ فیصلوں پر تاریخ نہیں لکھی جاتی اور بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ فیصلے تاخیر سے سنانے کے باوجود فیصلوں پر فیصلہ لکھنے کی تاریخ، تاریخ سماعت ہی لکھ دی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا غلط روایت کی جانب اشارہ کرنے کے بعد اس مسئلے کے حل کے تین سوالات رکھے ہیں جو کہ ذیل ہیں۔

1. کیا فیصلے پر تاریخ لکھی جائے گی؟
2. کسی فیصلے پر اگر تاریخ فیصلہ موجود نہ ہو تو اس کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں؟
3. اگر کسی فیصلے پر تاریخ فیصلہ درج نہیں ہے اور وہ فیصلہ چیٹنج ہو جائے تو کیا ریکارڈ اور ارد گرد کے حالات واقعات کو مد نظر رکھا جاسکتا ہے کہ کیا فیصلہ بروقت چیٹنج ہوا ہے یا نہیں؟

عدالت کی جانب سے سوالات رکھے جانے کے بعد ان سوالات پر عدالت کی معاونت کے لئے مخدوم علی خان ایڈووکیٹ اور طارق عزیز ایڈووکیٹ کو بطور معاونین عدالت⁴¹ مقرر کیا گیا اور عدالت عظمیٰ کے ایڈیشنل رجسٹرار کو بھی معاونت کے لئے طلب کیا گیا۔

پہلے سوال کے جواب میں مخدوم علی خان ایڈووکیٹ نے مجموعہ ضابطہ دیوانی⁴² کے مختلف دفعات عدالت کے سامنے رکھے جس میں آرڈر ۲۰ رول ۱ {۲}، ۳ اور ۷ اور آرڈر ۴۱ کے رول ۳۰ اور ۳۱ شامل ہیں جبکہ دوسری جانب طارق عزیز ایڈووکیٹ نے عدالت عظمیٰ رولز سے عدالت کی معاونت کی۔ مجموعہ ضابطہ دیوانی اور عدالت عظمیٰ رولز⁴³ کے مختلف دفعات کا جائزہ لینے کے بعد عدالت نے عدالت عظمیٰ کے پرانے فیصلوں کا جائزہ لیا ہے۔ انڈیا، ڈھاکہ اور عدالت عظمیٰ کے مختلف فیصلوں کا جائزہ لینے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ عدالت عالیہ کی جانب سے بروقت فیصلہ سنایا جانا لازمی ہے اور اگر کسی فیصلے پر تاریخ فیصلہ نہیں لکھا جاتا تو یہ جج کی جانب سے ایک مس کنڈکٹ⁴⁴ کے زمرے میں آتا ہے۔ یہاں پر جسٹس صاحب نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا کہ چونکہ عدالت عظمیٰ کے پاس باقی عدالتوں پر چیک اینڈ بیلنس کا اختیار بھی ہے تو اس لئے لازمی ہے کہ ہم خود بھی مندرجہ بالا اصولوں کی پاسداری کریں۔ مجموعہ ضابطہ دیوانی، عدالت عظمیٰ رولز، آئین پاکستان اور عدالتی نظائر کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ فیصلوں پر تاریخ فیصلہ لکھنا لازمی اور ضروری ہے اور تاریخ فیصلہ سے مراد فیصلہ لکھنے، سنانے اور دستخط کرنے کی تاریخ ہے۔ دوسرے سوال کا جواب عدالت نے کچھ یوں دیا ہے

⁴¹ **Amicus Curiae:** An amicus curiae is an individual or organization who is not a party to a legal case, but who is permitted to assist a court by offering information, expertise, or insight that has a bearing on the issues in the case.

⁴² The Code of Civil Procedure, 1908.

⁴³ Supreme Court Rules, 1980.

⁴⁴ Misconduct means dereliction of duty or unlawful or improper behavior. It also refers to an attorney's dishonesty or attempt to persuade a court or jury by using deceptive or reprehensible methods.

کہ فیصلوں پر تازہ فیصلہ نہ ہونے کے نتائج بڑے خطرناک ہو سکتے ہیں کیونکہ اگر کوئی فیصلہ چیلنج ہو جائے اور اس پر تازہ فیصلہ نہ ہو اور عدالت غلطی سے اصل تازہ فیصلہ کا پتہ نہ لگا سکے تو اس کے بڑے خطرناک نتائج ہو سکتے ہیں۔ تیسرے سوال کا جواب عدالت نے کچھ یوں دیا ہے کہ فیصلوں پر تازہ فیصلہ نہ ہونے سے ایک تو عدالتی عملے اور عدالت کے قیمتی وقت کا بھی ضیاع ہوتا ہے۔

فیصلے کے آخر میں عدالت نے لکھا ہے کہ عدالتی فیصلوں پر تازہ فیصلہ نہ لکھ کر جج صاحبان تنقید سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، تاہم اس تاثر کو ختم کرنا ہو گا اور چونکہ ہمارے پاس باقی نئی عدالتوں کے احتساب کا اختیار بھی ہے تو اس وجہ سے ہمیں خود اپنے عمل سے مندرجہ بالا اصولوں کو اپنانا ہو گا۔

مندرجہ بالا تمام امور کی طرف صراحتی اشارہ کرنے کے بعد جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ فریقین کے دلائل اور ریکارڈ کا جائزہ لینے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ یہ تمام درخواستیں بروقت جمع کی گئی ہیں تو اس لئے ان درخواستوں کو باقاعدہ سماعت کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔

نوٹ: عدالت عظمیٰ نے اس فیصلے کو تمام اعلیٰ عدالتوں کے رجسٹرار صاحبان کو بھیجے کا حکم دیتے ہوئے صراحتاً لکھا ہے کہ اعلیٰ عدالتوں سمیت تمام جج صاحبان فیصلوں پر تازہ فیصلہ لکھنے کے پابند ہیں اور تازہ فیصلہ سے مراد فیصلے لکھنے، سنانے اور دستخط کرنے کی تاریخ ہے۔

آرٹیکل ۲-اے (قرارداد مقاصد) کی پاکستانی آئین میں حیثیت پر عدالت عظمیٰ کا اہم فیصلہ

محمد اسد⁴⁵

عدالت کے سامنے بنیادی سوالات یہ تھے کہ کیا عدالت آئین پاکستان کے کسی آرٹیکل کو اسلامی قوانین یا آرٹیکل ۲-اے⁴⁶ میں درج اسلامی احکامات کی پابندی جیسے اصولوں کی خلاف ورزی کی بنیاد پر کالعدم قرار دے سکتی ہے؟ اگر ہاں تو کیسے اور اگر نہیں تو اس مجوزہ خلاف ورزی کو کون درست کرے گا اور عدالت کا اس معاملے میں کیا کردار ہو گا؟ ان سوالات کے جوابات چیف جسٹس نسیم حسن شاہ نے اپنے تاریخی فیصلے "حاکم خان بنام ریاست"⁴⁷ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

حقائق:

وزیراعظم بینظیر بھٹو کی ہدایت پر صدر پاکستان نے ۸/۷ دسمبر ۱۹۸۸ کو آئین پاکستان کی آرٹیکل ۴۵ کے تحت حاصل اختیار کو استعمال کرتے ہوئے سزاؤں میں معافی کا ایک حکم نامہ جاری کیا جس کے تحت جیلوں میں بند قیدیوں کی مختلف سزاؤں میں تخفیف/ کمی کی گئی اور انہی میں سے ایک تخفیف/ کمی چھانسی کے انتظار میں قید مجرموں کی سزاؤں کو عمر قید میں تبدیل کرنا شامل تھا جسکی وجہ سے مختلف لواحقین/متاثرین ناخوش ہوئے اور انہوں نے صدر کے اس عمل کو عدالتوں میں چیلنج کیا اور یہ موقف لیا کہ چونکہ اسلامی قانون کی رو سے کسی مجرم کو معاف کرنے کا اختیار صرف ولی یا متاثرہ شخص کے پاس ہوتا ہے اور آئین کے آرٹیکل ۲-اے میں واضح طور پر درج ہے کہ کوئی بھی قانون اسلامی حدود سے تجاوز کر کے نہیں بنایا جائے گا۔ پس آئین پاکستان کے آرٹیکل ۴۵ کے تحت صدر پاکستان کو حاصل معافی دینے کا اختیار غیر اسلامی ہے، پس اسکو کالعدم قرار دیا جائے۔ اسی موقف کو لاہور عدالت عالیہ میں رٹ درخواست نمبر ۲۶ میں پیش کیا گیا جس پر لاہور کورٹ نے انکے موقف کو درست تسلیم کرتے ہوئے قرار دیا کہ صدر کے پاس تعزیری سزاؤں کے علاوہ حدود، قصاص، اور دیت آرڈیننس کے تحت دی گئی سزاؤں کو معاف کرنے کا اختیار نہیں پس آرٹیکل ۴۵ کو کالعدم قرار دیا گیا۔ لاہور ہائیکورٹ کے اس فیصلے کو سول اپیل نمبر ۳۹ اور ۲۸ کے تحت عدالت عظمیٰ میں ان لوگوں نے چیلنج کیا جسکی پھانسی کی سزا صدر کے معافی نامہ کے تحت عمر قید میں تبدیل ہوئی تھی لیکن لاہور عدالت عالیہ کے فیصلے نے انکی سزا پھر سے بحال کر دی تھی۔

⁴⁵ طالب علم شریعہ و قانون، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد، پاکستان۔

⁴⁶ Article 2A: The Objectives Resolution to form part of substantive provisions: The principles and provisions set out in the Objectives Resolution reproduced in the Annex are hereby made substantive part of the Constitution and shall have effect accordingly.

⁴⁷ PLD 1992 SC 595

عدالت عظمیٰ کے سامنے بنیادی سوال یہ تھا کہ کیا آرٹیکل ۲-۱ اے سچ میں کوئی سپر آئینی آرٹیکل 48 ہے جو آئین کو کنٹرول کرتا ہے جس طرح ہائیکورٹ نے قرار دیا اور کیا کوئی عدالت آرٹیکل ۲-۱ اے یا اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کے دعویٰ کی بنیاد پر آئین کے کسی حصے جیسے آرٹیکل ۲۵ کو کالعدم قرار دے سکتی ہے یا نہیں۔ عدالت نے ان سوالوں کے جوابات ڈھونڈنے اور آرٹیکل ۲-۱ اے کے مقام کا تعین کرنے کیلئے آرٹیکل ۲-۱ اے کی عدالتی تاریخ دیکھی اور آسمہ جیلانی اور ضیاء الرحمن کیس کا جائزہ لیکر ثابت کیا کہ اعلیٰ عدلیہ کی نظر میں قرارداد مقاصد کی حیثیت، ۱۹۸۵ کی آٹھویں آئینی ترمیم سے قبل سپر آئینی دستاویز کے بجائے محض آئین کے افتتاحیہ کی تھی، لیکن ضیاء الرحمن کیس کے فیصلے میں چند رہنما کس نے ایسا تصور چھوڑا کہ جیسے قرارداد مقاصد کو آرٹیکل کی شکل میں آئین کا حصہ بنایا جائے تو وہ سپر آئینی کی حیثیت پالے گا۔ مزید وضاحت کیلئے عدالت نے ۱۹۲۹ میں قرارداد مقاصد کی منظوری کے وقت اسمبلی فور پر ہونے والی مختلف تقاریر اور اس کے بعد کے اقدامات کا جائزہ لیکر ثابت کیا کہ قرارداد مقاصد کو منظور کرتے ہوئے پارلیمان کی پری بھی اسکو سپر آئینی دستاویز کا درجہ دینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ اسکو محض ایک ایسے افتتاحیہ کے طور پر دیکھ رہا تھا جو پارلیمان کی آئین سازی کے دوران رہنمائی کرے۔

اسکے بعد عدالت نے کسی بھی قانون کی تشریح کے دو اصول جو عدالتی فیصلے 49 میں درج ہیں، کا ذکر کیا کہ کسی بھی قانون سے متعلق پارلیمان کی نیت جانچنے کیلئے سارے آئین کو ایک ساتھ دیکھا جائے اور آئین کے دو آرٹیکلز میں تصادم ہونے کی صورت میں انکے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اور اس معاملے پر لاہور عدالت عالیہ کے فیصلے میں ان دو اصولوں کو نہ اپنانے کا ذکر کیا۔ سول اپیل نمبر ۳۹ میں ایلیمنٹن کے وکیل ایڈووکیٹ ڈاکٹر عبدالباسط کے دلائل کی عدالت نے تعریف کی اور انکو فیصلے کا حصہ بنایا۔ ڈاکٹر عبدالباسط کے مطابق قرارداد مقاصد کی رو سے اقتدار اعلیٰ خدا کی طرف سے عوام کو تفویض کیا گیا ہے جو کہ وہ اپنے نمائندوں یعنی پارلیمان کے ذریعے استعمال کریں گے۔ اس پوری سکیم میں عدلیہ کو کہیں پر بھی اقتدار اعلیٰ تفویض نہیں کی گئی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قانون سازی کا اختیار عدالت کے بجائے پارلیمان کے پاس ہے اور یہی نیت پارلیمان کی اس وقت بھی تھی جب وہ قرارداد مقاصد کو منظور کر رہی تھی، پس عدلیہ آئین میں درج کسی اور بنیاد پر، کسی قانون کو کالعدم قرار دینے کا اختیار پھیلے رکھتی ہو لیکن آرٹیکل ۲-۱ اے کی بنیاد پر اسکے کے پاس ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انکے مطابق صدر کا معافی نامہ عام عدالتوں سے سزایافتہ عام مجرموں کے بجائے محض فوجی عدالتوں سے سزا پانے والے سیاسی قیدیوں کیلئے تھا۔ عدالت عالیہ نے ان سب دلائل و حقائق کی روشنی میں یہ فیصلہ دیا کہ عدالت آرٹیکل ۲-۱ اے یا اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کی بنیاد پر کسی قانون کو کالعدم قرار دینے کا اختیار نہیں رکھتی اور اگر ایسا قانون عدلیہ کے سامنے آجائے تو وہ یہ بات پارلیمان کے علم میں لائے، اور صرف وہی اسکو درست کرنے یا کوئی اور مناسب اقدام اٹھانے کا اختیار رکھتی ہے جبکہ عدالت نے اس معاملے پر درج ایپیلوں کو واپس عدالت عالیہ رہیمانڈ کر دیا اور ہدایت کی کہ اس معاملے کو آرٹیکل ۲-۱ اے کی بنیاد پر دیکھنے کے بجائے، اس بنیاد پر دیکھے کہ آیا صدر کے معافی نامہ آرڈر میں تمام مجرموں کی سزائیں مراد تھی یا محض سیاسی قیدی مراد تھے؟ اور کیا مؤخر الذکر صورت میں جیل حکام کی طرف سے سب کو فائدہ دینے کے احکامات کالعدم قرار دیے جاسکتے ہیں یا نہیں۔

اس فیصلے سے بیٹج میں موجود دیگر ۴ ججز نے اتفاق کیا جبکہ جسٹس شفیع الرحمن اور عبدالشکور الاسلام نے اضافی نوٹ بھی لکھے، جو کافی اہم ہے۔

دیوانی مقدمات میں جرح کیے بغیر دستاویزی شہادت پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اور بار شہوت ہمیشہ کس پر ڈالا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے اسلام آباد عدالت عالیہ کا ایک اتھارٹی اہم فیصلہ⁵⁰

49 PLD 1957 SC 219

50 Burden of Proof

51 Title of the case M/s Naseem & Company and others Vs Capital Development Authority and others and can be searched as Writ Petition no.3159 of 2020.

دیوانی مقدمات میں جرح کیے بغیر کیا صرف دستاویزی شہادت پہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا ہر کیس میں بار ثبوت یا ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری کلی طور پر صرف مدعی پر ہی آئے گی یا اسکو مدعی علیہ یا کسی تیسری پارٹی کی طرف بھی منتقل کیا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب جسٹس سردار اعجاز اسحاق خان نے اس فیصلے میں تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔ تفصیل میں جانے سے پہلے کیس کے مختصر حقائق کچھ یوں ہیں کہ نسیم جاوید (مدعی نمبر ۱) نے اپنی کمپنی ایم۔ ایس نسیم اینڈ کمپنی (مدعی نمبر ۲) کے ذریعے ۱۹۹۱ میں سی ڈی اے (مدعی علیہ) کو کھوٹے کے صنعتی زون میں ایک ۲۲۲۲ مربع گز کے صنعتی پلاٹ کی الاٹمنٹ کی درخواست دی جس کو سی ڈی اے نے منظور کیا اور تین سالہ اقساط پر مدعی کو فروخت کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔ مدعی کے مطابق اس نے پلاٹ کے ۵ فیصد اقساط ادا کر دی تھیں لیکن سی ڈی اے وقت مقررہ پر نہ اسکو کھوٹے کا قبضہ دے سکا اور نہ ہی اسکو بہتر کر سکا۔ آخر کار سی ڈی اے نے ۲۰۰۰ میں مدعی کی طرف سے بقایا اقساط ادا نہ کرنے کی بنیاد پر اس الاٹمنٹ کو منسوخ کر دیا جسکو مدعی نے عدالت میں چیلنج کیا۔ مدعی نے عدالت میں دعویٰ استقرار حق دائر کیا یعنی عدالت سے استدعا کی کہ مذکورہ پلاٹ اسکی ملکیت قرار دیکر اسکا قبضہ دلوا یا جائے اور اگر وہی پلاٹ نہیں دیا جاسکتا تو اسکا متبادل پلاٹ دیا جائے۔ جواب دعویٰ میں سی ڈی اے نے مدعی کے تمام دعوؤں کو مسترد کیا۔ لیکن ٹرائل کورٹ میں دوران جرح مدعی علیہ یعنی سی ڈی اے کے گواہ نے مدعی کے اس دعوے کو کہ، سی ڈی اے اسکو وقت مقررہ پر پلاٹ کا قبضہ دلوانے میں ناکام رہا، کو کلی طور پر مسترد نہیں کیا اور یہ کہ اس علاقہ میں الاٹ کئے گئے باقی پلاٹوں کے مقابلے میں انکے الاٹیز⁵³ کو متبادل جگہیں فراہم کی گئی تھی، کے دعویٰ کو بھی تسلیم کیا۔ لیکن سی ڈی اے نے خود بھی، نہ ہی ٹرائل کورٹ نے مدعی کی زبانی درخواست کی بنیاد پر سی ڈی اے کو باقی الاٹیز کو متبادل جگہیں فراہم کرنے سے متعلق ریکارڈ کو عدالت میں پیش کرنے کا پابند نہیں کیا کیونکہ وہ ریکارڈ مدعی کے متبادل جگہ فراہم کرنے کے دعوے سے متعلق تھا اور اس دعویٰ کے حق میں ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری مدعی پر ڈالی گئی۔ لیکن جب مدعی نے اپنی کوششوں سے کچھ ریکارڈ نکلا یا اور اسکو مجموعہ ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۱۳، رول ۲ کے تحت عدالت میں اضافی ثبوت کے طور پر جمع کروانے کی درخواست دی تو ٹرائل کورٹ نے اسکو مدعی کے کیس میں کمزوریوں کو پر کرنے کی کوشش جیسی وجوہات کی بنا پر ۳ ستمبر، ۲۰۲۰ کو ایک آرڈر کے ذریعے مسترد کر دیا۔ جس پر مدعی نے اس مذکورہ آرڈر کے خلاف اسلام آباد عدالت عالیہ میں رٹ کی درخواست دائر کی۔ یاد رہے یہ کیس اس سے پہلے بھی عدالت عالیہ میں آکر واپس ٹرائل کورٹ کو ریمانڈ کیا جا چکا تھا۔

عدالت عالیہ نے سب سے پہلے بار ثبوت کی دو قسموں، قانونی بار ثبوت⁵⁴ اور اور شہادت بار ثبوت⁵⁵ کی تقسیم کو واضح کیا اور یہ قرار دیا کہ عموماً قانونی بار ثبوت پورے کیس میں ایک ہی پارٹی یعنی مدعی پر آتا ہے لیکن شہادت بار ثبوت کیس کے دوران منتقل ہوتا رہتا ہے اور یہ مدعی سے مدعی علیہ یا کسی تیسری پارٹی کی جانب منتقل ہو سکتا ہے، اپنے اس موقف کے حق میں عدالت نے دو عدالتی⁵⁶ نظائر پیش کیے جس میں مندرجہ بالا اصول یعنی شہادت بار ثبوت کو مدعی سے مدعی علیہ کی طرف منتقل کیا گیا تھا، اور یہی بات قانون شہادت آرڈر ۱۹۸۳ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جس کے آرٹیکل ۱۱ اور ۱۱۸ گواہ بار ثبوت مدعی پر ڈالتے ہیں لیکن آرٹیکل ۱۲۲ کے تحت بار ثبوت مدعی علیہ یا کسی تیسری پارٹی کی طرف بھی منتقل ہو سکتا ہے اگر کسی مخصوص امر/حقائق کے متعلق معلومات یا ثبوت محض اس پارٹی کی علم، اختیار یا قبضے میں ہوں اور یہ اصول مندرجہ بالا ذکر کئے گئے دو عدالتی نظائر میں سے مؤخر الذکر نظیر میں انتہائی وضاحت سے درج ہے۔ عدالت عالیہ نے اس کے ساتھ بہترین ثبوت کا اصول⁵⁷ کا ذکر کیا جس کے مطابق کسی کیس میں سب سے زیادہ متعلقہ اور پر اثر ثبوت ضرور پیش کئے جانے چاہیے اور ایسے متعلقہ ثبوت کو روکنے/چھپانے میں ملوث پارٹی کے متعلق عدالت یہ فرض کر سکتی ہے کہ مذکورہ ثبوت اس پارٹی کی مخالف ہیں تبھی انکو چھپایا گیا، اس اصول کو عدالت عظمیٰ نے اپنے دو فیصلوں⁵⁸ میں اپنا یا ہے۔ جبکہ یہی بات قانون شہادت آرڈر ۱۹۸۳ کے آرٹیکل ۱۰۲ کو آرٹیکل ۱۲۹ [جی] کے ساتھ ملا کر دیکھی جاسکتی ہے۔

⁵² طالب علم شریعہ و قانون، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

⁵³ Allotees: a person to whom something is allotted, especially land or shares.

⁵⁴ Legal burden of proof

⁵⁵ Evidential burden of proof

⁵⁶ 1993 SCMR 848, 1997 MLD 1064.

⁵⁷ Best evidence rule

⁵⁸ 1991 SCMR 2126, 2008 PLC 304.

اس بحث کے نتیجے میں عدالت نے یہ قرار دیا کہ سی ڈی اے کے قبضے میں موجود وہ ریکارڈ جس میں مدعی کے علاوہ باقی الاٹیز کو متبادل جگہیں دینے کے ثبوت موجود ہیں، چونکہ وہ کیس کے ایک بنیادی سوال کہ الاٹ کردہ پلاٹ پر مدعی کی ملکیت ثابت ہو جانے اور اصل پلاٹ اب نہ مل سکنے کی صورت میں کیا مدعی متبادل پلاٹ لینے کا حق رکھتا ہے یا نہیں، سے قانون شہادت آرڈر ۱۹۸۴ کے آرٹیکل ۲۲، ۲۰ اور ۴۹ کے تحت جڑے ہوئے حقائق میں سے ہے، تو اوپر ذکر کردہ دلائل و عدالتی نظائر کی روشنی میں اس ریکارڈ کو عدالت میں پیش کرنے کی ذمہ داری مدعی کے بجائے مدعی علیہ یعنی سی ڈی پر ڈالی جاسکتی ہے کیونکہ متبادل الاٹمنٹس دیے جانے کا یہ ریکارڈ مدعی کے بجائے مدعی علیہ کے قبضے و اختیار میں ہے۔ اور سی ڈی اے ایک عوامی ادارہ ہونے کی حیثیت سے آئین کے آرٹیکل ۲۵⁵⁹ کے تحت متبادل جگہیں فراہم کرنے کے دوران تمام الاٹیز کے ساتھ یکساں طریقے سے پیش آنے کا پابند ہے۔

عدالت عالیہ نے اپنے فیصلے میں ٹرائل کورٹ کے دوران سماعت غیر فعال کردار پر گرفت کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ عدالت کا کام محض خاموش ناظر/ تماشاگاہی کا نہیں اور نہ ہی مجموعہ ضابطہ دیوانی اسکوبے اختیار بنانے یا اسکے ہاتھ باندھنے کیلئے لکھا گیا ہے بلکہ قانون شہادت آرڈر ۱۹۸۴ کے آرٹیکل ۱۶۱ کے تحت عدالت فریقین سے سوالات پوچھنے، مختلف قسم کے متعلقہ دستاویزات طلب کرنے جیسے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے ایک فعال کردار ادا کر سکتی ہے۔ مزید یہ کہ ٹرائل کورٹ مجموعہ ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۱۵ رول ۳ [۱] کے تحت پہلے اس بنیادی سوال کہ کیا مذکورہ پلاٹ کی الاٹمنٹ سی ڈی اے نے درست منسوخ کی تھی یا نہیں، کے جواب کا تعین کر سکتی تھی اور الاٹمنٹ منسوخ کے غلط ثابت ہونے کی صورت میں ٹرائل کورٹ مدعی کو متبادل جگہ فراہم کرنے کے حق سے متعلق سوال کی طرف جاسکتی تھی اور مجموعہ ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۱۵ رول ۳ [۱] کے تحت ٹرائل کورٹ سماعت سی ڈی اے کی طرف سے ریکارڈ فراہم ہی تک روک سکتی تھی اور اگر پہلے سوال کا جواب نفی میں آجاتا تو دوسرے سوال کی طرف ٹرائل کورٹ کو جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اور اس پہلے سوال کا جواب ملنے کی بنیاد پر ہی کیس کا فیصلہ سنایا جاسکتا تھا کیونکہ آرڈر ۱۵ رول ۳ عدالت کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ کسی کیس میں پہلے ایک سوال پر فیصلہ سنا دے اور اگر اس سوال کے تعین کے بعد ضرورت رہے تو باقی سوالات کے جوابات بھی ڈھونڈ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹرائل کورٹ مجموعہ ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۱۴ رول ۵ کے تحت خود بھی فیصلہ سنانے سے پہلے کوئی سوال جیسے کیا سی ڈی اے نے اصل پلاٹ کا نہ دے سکنے کی صورت میں متبادل پلاٹ فراہم کئے تھے، کو تعین کرنے کیلئے اٹھا سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی عدالت عالیہ نے مدعی کے وکیل کی توجہ اس بات کی طرف بھی مبذول کروائی کہ وہ بجائے اس لیے عمل یا جرح کی طرف جانے کہ مجموعہ ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۱۲ رول ۴ کے تحت سی ڈی اے کو کیس کے متعلق حقائق کو ماننے یا مسترد کرنے یا اسی مجموعہ کے آرڈر ۱۱ کے تحت برآمدگی، معائنہ یا تفتیش کا نوٹس دیکر اپنے مقصد، متعلقہ ریکارڈ و حقائق کے حصول کو آسان/ ممکن بنا سکتے تھے۔

فیصلے کے آخر میں عدالت عالیہ نے ٹرائل کورٹ کے اس حکم کو، جس میں مدعی کی طرف سے سی ڈی اے کے قبضہ میں موجود کیس سے متعلقہ ریکارڈ عدالت میں پیش کرنے کی درخواست کو مسترد کیا تھا، کو اس بنیاد پر منسوخ کیا کہ ٹرائل کورٹ نے اپنے آرڈر میں قانونی بار ثبوت کو شہادت/ دستاویزی ثبوت مہیا کرنے کی ذمہ داری کے ساتھ منسلک کرنے اور وہ دستاویزی ثبوت جو کہ مدعی کے قبضے و اختیار میں ہی نہیں تھے، کی ذمہ داری اس پر ڈالنے سمیت پبلک ریکارڈ کے محافظ ایک اورے یعنی سی ڈی اے کو پبلک ریکارڈ روکنے، ظاہر نہ کرنے کا اختیار دیکر غلطی کی ہے۔ اسکے علاوہ عدالت عالیہ نے ٹرائل کورٹ کو یہ اختیار دیا کہ وہ فیصلے میں دیے گئے مختلف متبادل حل میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے فریقین کے درمیان اس کیس کا فیصلہ کر لے اور فیصلے کے اختتام میں سی ڈی اے کے وکیل کے کام کی تعریف بھی کی۔

⁵⁹ **Article 25. Equality of citizens:** (1) All citizens are equal before law and are entitled to equal protection of law. (2) There shall be no discrimination based on sex. (3) Nothing in this Article shall prevent the State from making any special provision for the protection of women and children.

مقدمات میں ہارنے والے فریق کو لاگت ادا کرنے یا ہرجانہ ڈالنے کے حوالے سے اسلام آباد عدالت عالیہ کا ایک مفصل فیصلہ⁶⁰

سجاد حمید یوسفی⁶¹

مذکورہ کیس میں معزز جج بابر ستار صاحب نے طے کیا کہ عدالتوں پہ لازم ہے کہ وہ مقدمات کا فیصلہ سنانے کے ساتھ ہی ہارنے والے فریق پہ ہرجانہ ڈالے اور وہ ہرجانہ جیتنے والے فریق کو ادا کیا جائے۔

مزید یہ طے کیا کہ اگر جیتنے والا فریق اگرچہ ہرجانہ یا نقصان کا مطالبہ نہ کرے تب بھی عدالت پہ لازم ہے کہ وہ لاگت ڈالے اور وہ لاگت جیتنے والے فریق کو ادا کیا جائے۔ کیونکہ لاگت سے متعلق قانون [قانونی چارہ جوئی کے اخراجات ایکٹ، ۲۰۱۷] 62 اور مجموعہ ضابطہ دیوانی کے دفعہ ۳۵ کے تحت اس بابت عدالتوں پہ لازم کیا گیا ہے وہ لاگت ہر صورت ڈالیں۔ ان قوانین مسودات میں "شیل" 63 کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ لزوم پہ دلالت کرتا ہے۔ اس موقع پہ معزز جج صاحب نے یہ بھی طے کیا کہ کب کوئی کوئی دفعہ ہدایاتی دفعہ تصور ہوگی اور کب وجوبی تصور ہوگی۔ یہ تب تبھی طے کیا جاسکے گا جب پورا مسودہ پڑھ کر مقننہ کی اصل نیت جانچی جائے گی۔

مزید یہ بھی طے کیا گیا کہ ہر عدالت ہارنے والے فریق پہ صرف اسی حد تک لاگت ڈال سکتی ہے جس حد تک اسی عدالت کے سامنے مقدمے کی سماعت ہوئی ہے۔ یہ لاگت فریق کو ادا کیا جائے گا نہ کہ اس کے کونسل کو۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ عدالت ہارنے والے فریق کے وکیل کی فیس تو طے نہیں کر سکتی مگر لاگت کا تخمینہ لگاتے ہوئے عدالت کو دیکھنا چاہیے کہ جیتنے والے فریق نے اپنے وکیل کو معقول فیس ادا کی ہے یا پھر بہت زیادہ فیس ادا کی گئی ہے۔ اگر فیس بہت ہی زیادہ ادا کی گئی ہے تو عدالت اس صورت حال میں طے کرے گی کہ ایک معقول فیس اس کیس کی کیا ہو سکتی ہے۔ اور پھر وہی معقول فیس ہی بطور لاگت شامل کی جائے گی نہ غیر معقول فیس۔ یہ اس لیے تاکہ لاگت ڈالنے کی وجہ سے معاشرے کے ان طبقات کی جو کہ معاشی طور پر کمزور ہیں حوصلہ شکنی نہ ہو اور وہ عدالت میں آنے سے غیر ضروری گریز اختیار نہ کرے۔ پھر یہ بھی پیرا نمبر پندرہ میں طے کیا گیا کہ لاگت کیسے ڈالی جائے گی اور کن کن عوامل کو دیکھ کر لاگت ڈالی جاسکتی ہے۔

عدالت نے یہ بھی طے کیا کہ مقدمہ ہارنے پہ الگ لاگت ہوگی اور مقدمے میں ایسے اعتراض اٹھانے یا گذارشات کرنے پہ جو کہ صرف تنگ کرنے کی غرض سے کی گئی ہوں اور واضح طور پر بے بنیاد ہوں، علیحدہ لاگت ڈالی جائے گی۔

عدالت عظمیٰ کا دیوانی مقدمہ جات میں گواہ کا بیان بذریعہ ویڈیو کانفرنسنگ ننگ ریکارڈ کروانے کے حوالے سے ایک اہم فیصلہ⁶²

حمزہ خان⁶³

عدالت عظمیٰ کے سامنے سوال یہ تھا کہ کیا دیوانی مقدمہ میں کسی گواہ کی گواہی بذریعہ ویڈیو کانفرنسنگ ریکارڈ کروائی جاسکتی ہے یا نہیں۔

حقوق:

⁶⁰ Execution First Appeal-12-2018 of Islamabad High court and can be searched as 2022 CLC 1064.

⁶¹ ایڈووکیٹ، عدالت عالیہ وہابی آئین و قانون۔

⁶² Costs of Litigation Act, 2017

⁶³ Shall

⁶⁴ This important judgement is written by Justice SYED MANSOOR ALI SHAH and can be searched and cited as PLD 2023 SC 211.

⁶⁵ ایڈووکیٹ، خیبر پختونخوا ہار کونسل

مدعی الیہ نے مدعی پر ہتک عزت کے بناء پر ہر جانے کا دعویٰ کیا۔ مدعی نے اپنا جواب دعویٰ جمع کروایا، تحقیقات وضع ہوئے، اور شہادت مدعی الیہ بھی قلمبند ہوا۔ مدعی نے اپنے گواہان پیش کر کے خود بطور { ڈی-ڈبلیو ۴ } اپنا بیان قلمبند کروایا جس کے بعد میں اس پر جرح شروع ہوئی۔ مذکورہ جرح اسی تاریخ پیشی کے بعد اگلے تاریخ پیشی پر بھی مکمل نہ ہو سکی اور پھر وکلاء ہڑتال اور دیگر وجوہات کے بناء پر ملتوی ہوتی رہی۔ اسی دوران مدعی نے کینیڈا جاکر درخواست برائے ریکارڈ کروانے جرح بذریعہ ویڈیو کا نفرنہ نگ دائر عدالت کی۔

درخواست میں مدعی نے مؤقف اپنایا تھا کہ وہ ۲۰۱۶ء سے اپنے بچوں کے ہمراہ کینیڈا میں مقیم ہے، وہ اپنا بیان ریکارڈ کروانے کے لئے بار بار حاضر عدالت ہوتی رہی تاہم مختلف وجوہات کے بناء پر بیان مکمل طور پر ریکارڈ نہ ہو سکا، اور اس کے لئے اپنے بچوں کو چھوڑ کر پاکستان آنا، نہایت مشکل، تکلیف دہ اور بے جا مالی نقصان کا باعث ہو گا۔ دوسری طرف مدعی الیہ نے درخواست مذکورہ کی بھرپور مخالفت کی، اور ٹرائل کورٹ نے درخواست مدعی خارج کی۔ اسی طرح عدالت عالیہ نے بھی مذکورہ حکم کے خلاف مدعی کی طرف سے دائر کردہ نظر ثانی کی درخواست⁶⁶ خارج کی، جس سے نالاں ہو کر مدعی نے اس عدالت کی طرف رجوع کیا۔

عدالت عظمیٰ کے سامنے سوال یہ تھا کہ دیوانی مقدمہ میں کسی گواہ کی گواہی بذریعہ ویڈیو کا نفرنہ نگ ریکارڈ کروائی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے عدالت نے متعلقہ قوانین کو ملاحظہ کیا۔ جس میں مجموعہ ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۱۸ رول ۴، دفعہ 67، اور قانون شہادت کا آرٹیکل 163 شامل تھے۔ مجموعہ ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۱۸ رول ۴ کے مطابق حاضر گواہ اپنے بیانات "اپن" کورٹ میں جج کی موجودگی اور نگرانی میں قلمبند کروائیں گے۔ اس رول میں حاضری کے معنی صرف جسمانی حاضری ہے یا اس میں "آن لائن" حاضری بھی شامل ہے؟ کیا حاضری کے لفظ کو وسعت دے کر اس کے معنی "آن لائن" حاضری لینا درست ہوگا؟

عدالت نے ان سوالات پر غور کرنے سے پہلے آئینی اور جمہوری معاشرے میں جج کے کردار کو زیر بحث لانا ضروری سمجھا۔ جج کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ قانون کا مقصد و غایت سمجھ کر معاشرے میں اس کا اطلاق کریں۔ چونکہ معاشرتی حقائق ہر وقت بدلتے رہتے ہیں اور قوانین دیر تک لاگورہتے ہیں، اس لئے قانون ساکن نہیں رہ سکتا۔ جج کو چاہئے کہ وہ قانون کو زندہ سمجھتے ہوئے قانون کی ایسی تعبیر و تشریح کریں جو بدلتے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو، تاہم قانون کے پیچھے جو اصل مقصد ہے، وہ کسی طور فوت نہیں ہونا چاہئے۔ اگر جج صرف ماضی کو زیر نظر رکھتا ہے اور بدلتے ہوئے حالات و واقعات سے بے خبر رہتا ہے تو وہ صرف تاریخ دان یا آرکیالوجسٹ رہ جاتا ہے۔ پس کسی قانون کا مقصد، ہدف، پالیسی، فنکشن اور "مقصد نیت" مد نظر رکھتے ہوئے نئے حالات میں بدلتے تقاضوں کے مطابق نئی تشریح کرنا ضروری ہے۔

اب آتے ہیں اس سوال کی طرف کہ کیا حاضری کے لفظ کو وسعت دے کر اس کے معنی و رچونک حاضری لینا درست ہوگا؟

عدالت نے فقیر محمد کیس میں عدالت عظمیٰ کے ڈویژن بینچ کے فیصلے پر انحصار کرتے ہوئے کہا کہ مذکورہ کیس میں عدالت نے قرار دیا تھا کہ کسی قانون کی نئی چیزوں تک توسیع [آئین کی تعمیر کا اصول]⁷⁰ یہی اصول اب [قوانین کی تعمیر کو اپ ڈیٹ کرنے کے اصول]⁷¹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی اصول کے تحت قوانین کی تعمیر وقت کے ساتھ ساتھ اپڈیٹ کی جاتی ہے، تاکہ قوانین اپنے روح کے مطابق نئے حالات میں درست طور پر اپلائی کئے جاسکیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کس مقصد اور پالیسی کے تحت قانون ساز نے گواہوں کے بیانات ریکارڈ کروانے کے لئے عدالت میں حاضری ضروری قرار دی ہے؟ کیا وچوکل حاضری سے یہ مقصد اور پالیسی فوت ہو جائے گی؟ مجموعہ ضابطہ دیوانی رول ۴ سے اس قانون کا مقصد اور پالیسی واضح ہوتی ہے۔ اس رول کے مطابق گواہ کا بیان "اپن" کورٹ میں جج کے زیر نگرانی ریکارڈ کروانا ضروری ہے۔ پالیسی یہ ہے کہ گواہ بغیر کسی دباؤ میں آکر اپنی مرضی سے اپنا بیان ریکارڈ کروائے۔ عدالت یہ یقینی بنانے کے لئے کہ گواہ بغیر کسی دباؤ کے اپنی

⁶⁶ Revision Petition

⁶⁷ **Rule 4 of Order 18 of CPC:** Witnesses to be examined in open Court: The evidence of the witnesses in attendance shall be taken orally in open Court in the presence and under the personal direction and superintendence of the Judge.

⁶⁸ **Section 151 of CPC:** Saving of inherent powers of Court: Nothing in this code shall be deemed to limit or otherwise affect the inherent power of the Court, to be exercised after recording reasons in writing, to make such orders as may be necessary for the ends of justice or to prevent abuse of the process of the Court.

⁶⁹ **Article 164 of QSO:** Production of evidence that has become available because of modern devices, etc. In such cases as the Court may consider appropriate, the Court may allow to be produced any evidence that may have become available because of modern devices or techniques.

⁷⁰ Principle of Construction of Statutes.

⁷¹ Updating Construction of Statutes.

مرضی سے بیان ریکارڈ کروائے، گواہ سے بالکل اسی طرح سوالات کر سکتا ہے جس طرح وہ عدالت میں حاضر ہونے والے گواہ سے کر سکتا ہے، مثلاً عدالت گواہ کو پورا کردہ کھانے کا حکم دے کر یہ یقینی بنا سکتی ہے کہ بیان ریکارڈ کرواتے وقت گواہ کے علاوہ کوئی اور شخص کمرے میں موجود نہ رہے۔ اگر گواہ کی پہچان کو متنازعہ بنایا جاتا ہے تو دستاویزات سے اس کو "کنفرنٹ" کیا جاسکتا ہے۔ پس ان تمام ضروری امور میں "فریکل" اور "درچوسل" حاضری کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ لہذا رول ۴ میں لفظ "حاضری" کی توسیع "آن لائن" حاضری تک کی جاسکتی ہے۔

عدالت کے سامنے اگلا سوال یہ تھا کہ عدالت کس قانون کے تحت کسی گواہ کا بیان بذریعہ ویڈیو کا نذر نہ ننگ ریکارڈ کروانے کے حکم جاری کر سکتی ہے؟ یہ ایک عمومی قاعدہ ہے کہ ہر طریقہ کار جائز اور درست ہے جب تک اسے ممنوعہ ثابت نہ کیا جائے۔ مجموعہ ضابطہ دیوانی کا دفعہ ۱۵۱⁷² عدالتوں کو اختیار دیتا ہے کہ وہ انصاف کی فراہمی کے لئے اور عدالتی "پراسس" کے غلط استعمال سے بچنے کے لئے تمام ضروری احکامات جاری کر سکتی ہے۔ چونکہ موجودہ کیس میں گواہ کی "فریکل" حاضری پر اصرار کرنا غیر ضروری تاخیر، اخراجات اور ضرر کا باعث ہوگا، لہذا "آن لائن" حاضری کی اجازت دے کر بذریعہ ویڈیو کا نذر نہ ننگ بیان ریکارڈ کروانا قرین انصاف و قانون ہے۔ پس موجودہ معاملہ دفعہ ۱۵۱ کے تحت آتا ہے۔

مزید برآں، فاضل وکیل مدعی نے قانون شہادت کے آرٹیکل ۱۶۴ کا حوالہ دیتے ہوئے موقف اپنایا کہ جدید ٹیکنالوجی یعنی ویڈیو کا نذر نہ ننگ کے ذریعے عدالت کو مدعی کا بیان ریکارڈ کروانا چاہئے۔ دوسری طرف وکیل مدعی الیہ نے شدید مخالفت کرتے ہوئے موقف اپنایا کہ مذکورہ آرٹیکل ۱۶۴ میں لفظ "ثبوت" کے معنی محض "دستاویزی ثبوت" ہے، جبکہ "زبانی ثبوت" ریکارڈ کروانے کے لئے عدالت میں حاضری لازم ہے۔ عدالت نے قانون شہادت کے آرٹیکل ۲ [۱] [۲] [۳] کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ثبوت کے معنی زبانی اور دستاویزی ثبوت دونوں ہیں۔ پس فاضل وکیل مدعی الیہ یہ نہیں ثابت کر پائے کہ لفظ ثبوت کا معنی محض دستاویزی ثبوت ہے۔

قانون شہادت کا آرٹیکل ۱۶۴ سائنس اور ٹیکنالوجی کو عدالت میں لانے کے لئے "دروازے" کی حیثیت رکھتا ہے۔ عدالتوں میں ٹیکنالوجی کے استعمال کے فوائد و ثمرات سے انکار ناممکن ہے۔ یہ انصاف تک رسائی، فیسر ٹرانس، اور جلد اور فوری انصاف کو ممکن بنا کر آئین پاکستان میں درج بنیادی حقوق مثلاً آرٹیکل ۱۰ اور ۱۹ [اے] کو جلا بخشتا ہے۔ مقدمہ ہڈا میں صرف مدعی مدعا علیہا ہے، اس لئے بوجہات بالا اس کا بیان بذریعہ ویڈیو کا نذر نہ ننگ ریکارڈ کروانا درست ہے۔ عدالت نے ماتحت عدالت کے فیصلے کو ناقابل بحالی قرار دے کر درخواست نگرانی منظور کیا۔ یوں مدعی کو اجازت مل گئی کہ وہ اپنا بیان کینیڈا سے ہی بذریعہ ویڈیو کا نذر نہ ننگ ریکارڈ کروا سکتی ہے۔

ماحولیات پر معزز حج جناب منصور علی شاہ صاحب کا ایک اہم فیصلہ⁷³

سجاد حمید یو سفزنی⁷⁴

حقائق:

حکومت پنجاب ماحولیات سے متعلق قانون کے تحت ایک نوٹیفیکیشن جاری کیا جس میں ایک مخصوص علاقے کو منفی علاقہ، قرار دیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس علاقے میں اب کے بعد نہ کوئی صنعتی پلانٹ لگے اور نہ ہی موجودہ صنعتی پلانٹس یا فیکٹریاں اپنی سرگرمیوں میں توسیع کر سکیں گی۔ جس علاقے کو منفی علاقہ قرار دیا گیا وہاں ڈی جی سینٹ کی فیکٹری اپنی کاروباری سرگرمیاں سرانجام دے رہی تھی نوٹیفیکیشن سے متاثر ہو کر ڈی جی سینٹ فیکٹری نے عدالت عظمیٰ میں درخواست دائر کر دی اور موقف اپنایا کہ نوٹیفیکیشن قانون کے مطابق نہ ہے اور نہ ہی ڈی جی سینٹ فیکٹری ماحول کو نقصان پہنچا رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جسٹس منصور علی شاہ نے تفصیل سے فیصلہ لکھا جس میں ذیل نکات زیر بحث آئے۔

⁷² Section 151. Saving of inherent powers of Court. Nothing in this Code shall be deemed to limit or otherwise affect the inherent power of the Court to make such orders as may be necessary for the ends of justice or to prevent abuse of the process of the Court.

⁷³ The citation of the judgement is 2021 SCMR 834.

⁷⁴ ایڈووکیٹ عدالت عالیہ

بین النسلی⁷⁵ انصاف کیا ہے؟

جسٹس صاحب نے لکھا کہ آنے والی نسلیں زبان نہیں رکھتی بلکہ وہ تو وجود بھی نہیں رکھتی لہذا ہم پہ بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم آنے والی نسلوں کی حفاظت کریں اور ان کے لیے محفوظ دنیا چھوڑ کر جائیں۔ ماحول کا تحفظ صرف اس لیے ضروری نہیں کہ اس میں موجودہ انسان رہ رہا ہے بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں آئندہ کا انسان بھی رہے گا۔ مزید اہم نکتہ یہ لکھا کہ ماحولیات سے متعلق کیسز میں اگر شواہد پورے نہ ہو یا کمزور ہوں تب عدالتیں ماحولیات کی تحفظ کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا حکم جاری کرے جس سے ماحول کا تحفظ ممکن ہو یعنی اس نوعیت کے کیسز میں ماحول ججز کا مرکز نگاہ ہونا ہے اور ماحول کی ضرورت اور تحفظ کو سامنے رکھتے ہوئے حکم جاری کرنا چاہیے۔

مزید لکھتے ہوئے معزز جج نے عجب نکتہ لکھا کہ ماحول کو آج کی دنیا بطور انسان دیکھنا چاہا رہی ہے یعنی اب ہمیں ماحول کو ایک انسان تصور کرنا ہو گا کہ جیسے انسان کے حقوق ہوتے ہیں اسی طرح ماحول کے بھی حقوق ہوں گے اور ہم جس طرح دیگر انسانوں کے حقوق ادا کرتے ہیں اسی طرح ہمیں ماحول کے حقوق بھی ادا کرنا ہوں گے ماحول کے حقوق یہی ہے کہ اس کا پورا پورا تحفظ کیا جائے اسے محفوظ رکھا جائے اسے ضرر نہ پہنچایا جائے وغیرہ وغیرہ۔ آج کے انسان کو چاہیے کہ وہ ماحول کے ساتھ دونوں کی بہتر مستقبل کے لیے سمجھوتہ کرے اور دونوں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں۔ (اس مقام پر معزز جج صاحب ماحول کو قانونی شخصیت قرار دیتے ہوئے نظر آئے)۔

یہاں سے آگے معزز جج صاحب نے پانی کا انصاف⁷⁶ لکھا اور کہا کہ ججز کے سامنے اگر پانی سے متعلق کوئی بھی کیس آتا ہے تو انہیں وہ کیس ماحول سے الگ تھلگ نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ ضروری ہے کہ ججز پانی سے متعلق کوئی بھی کیس ماحول کے ساتھ ملا کر دیکھیں ماحول سے الگ ہو کر نہیں کیونکہ پانی ماحول کا جز ہے جس کے بغیر کسی کا جینا ممکن نہیں ہے۔ نوٹ: مذکورہ فیصلے میں ماحولیات سے متعلق مغربی قوانین سے کافی مدد لی گئی ہے اور اس حوالے سے مذکورہ قوانین اور ججمنٹس کے حوالہ جات بھی دیے گئے ہیں۔

حراسمنٹ پر جسٹس منصور علی شاہ صاحب کا ایک بہترین فیصلہ⁷⁷

سجاد حمید یوسفزئی⁷⁸

پس منظر:

پی ٹی وی میں ملازمت کرنے والی پانچ خواتین نے پی ٹی وی کے کنٹرو لران چارج اطہر فاروق بٹر / مسؤل علیہ کے خلاف وفاقی محتسب کے سامنے حراسمنٹ کی شکایت درج کی۔ کیس چلا تو مسؤل علیہ مجرم پایا گیا اور وفاقی محتسب نے مسؤل علیہ کو ۲ لاکھ ۵۰ ہزار روپے بطور ہرجانہ پانچ خواتین کو ادا کرنے کا حکم صادر کیا۔ یہ ایک چھوٹی سزا تھی۔ اس حکم سے دونوں فریق متفق نہ ہوئے اور دونوں نے صدر پاکستان کے سامنے اپیل دائر کی۔ صدر پاکستان نے اپیل میں حکم صادر کرتے ہوئے مسؤل علیہ کے خلاف چھوٹی سزا کو بڑی سزا میں تبدیل کیا اور یوں مسؤل علیہ اطہر بٹر صاحب کو ملازمت سے برخاست کرنے کا حکم صادر کیا۔ یہ بڑی سزا تھی۔ اس کے خلاف مسؤل علیہ نے اسلام آباد عدالت عالیہ میں رٹ کی اور اسلام آباد عدالت عالیہ نے صدر پاکستان کے حکم کو معطل کیا اور وفاقی محتسب کے حکم کو قائم کیا۔ یوں مسؤل علیہ دوبارہ ملازمت پہ بحال ہوا۔ دونوں فریق اسلام آباد ہائی کورٹ کے حکم سے بھی متفق نہ تھے اور دونوں نے عدالت عظمیٰ میں پھر درخواست برائے اپیل دائر کی اور جسے معزز جج سید منصور علی شاہ نے منظور کرتے ہوئے اپیل میں تبدیل کی۔ اور مذکورہ ججمنٹ دی۔

عدالت عظمیٰ کا استدلال:

عدالت عظمیٰ نے کہا کہ عدالت عالیہ نے صدر پاکستان کے حکم کو اس بنیاد پر رد کیا ہے کہ اس میں وجوہات کا ذکر نہ ہے۔ حالانکہ یہ خلاف حقائق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ صدر پاکستان کے حکم میں سزا بڑھانے کے لیے تفصیل کے ساتھ وجوہات کا ذکر موجود ہے۔ اور انہی وجوہات کی بناء پر سزا بڑھائی گئی ہے۔ اس کے بعد عدالت عظمیٰ واضح کرتی ہے کہ

⁷⁵ Intergenerational justice is mainly defined as a form of distributive justice, where present generations hold an obligation towards future generation.

⁷⁶ Water justice

⁷⁷ The judgement is cited as Civil Petitions No.1347 & 1655 of 2019.

صدر کے حکم میں کہاں کہاں اور کن پیرا گرافس میں وجوہات موجود ہیں۔ مسنول علیہ نے عدالت عظمیٰ کے سامنے یہ گزارش کی کہ مذکورہ شکایت تاخیر سے درج کی گئی ہے اور ایسے کیسے مز میں تاخیر مقدمے کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ جس پہ عدالت عظمیٰ نے کہا کہ حراسمنٹ کے کیسے مز میں تاخیر سمجھ سے بالاتر نہیں بلکہ قابل فہم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جب کسی عورت کی عزت کے ساتھ کھیلا جاتا ہے تو وہ سوچ میں پڑ جاتی ہے اور اسے وقت درکار ہوتا ہے یہ سوچنے کے لیے کہ آیا شکایت درج کی جائے یا نہ کی جائے کیوں کہ شکایت درج ہونے کی صورت میں خاتون کو اپنی عزت مزید خراب ہونے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اس لیے خواتین شکایت درج کرانے میں وقت لے لیتی ہیں۔ اور یہ ایک معاشرتی مظہر ہے۔ لہذا مسنول علیہ کی یہ گزارش رد کی جاتی ہے۔

اس کے بعد عدالت عظمیٰ نے متعلقہ قانون [کام کی جگہ پر خواتین کو ہراساں کرنے کے خلاف تحفظ ایکٹ، ۲۰۱۰ء]⁷⁹ کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس قانون کی نفاذ کا اصل مقصد اس کی تمہید اور اغراض و مقاصد سے ظاہر کیا ہے۔ سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ اس قانون کا اصل مقصد یہ ہے کہ خواتین کو ملازمت کے مقام پہ ایک پرامن اور محفوظ ماحول فراہم کیا جاسکے اور انہیں کام کرنے یا ملازمت کرنے میں نہ تو کوئی امر مانع ہو اور نا ہی انہیں دقت پیش آئے۔

اس کے بعد عدالت عظمیٰ نے حراسمنٹ کی تعریف پہ روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ کوئی بھی ایسا عمل یارویہ جو کسی شخص کی ملازمت میں نخل ہو وہ حراسمنٹ کے زمرے میں آتا ہے اور اس کی ممانعت ضروری ہے۔ اس کے بعد عدالت عظمیٰ نے مذکورہ قانون میں ہونے والی ترامیم کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ پہلے مذکورہ قانون صرف خواتین تک محدود تھا مگر ترامیم کے بعد اس میں لفظ { کوئی شخص }⁸⁰ ڈالا گیا ہے اور اس سے مراد عورت، مرد اور خواجہ سرا تینوں ہیں۔ لہذا اس قانون کا تحفظ صرف خواتین کو نہیں بلکہ مرد اور خواجہ سراؤں کو بھی حاصل ہے۔

اس کے بعد عدالت عظمیٰ نے مذکورہ قانون کا رشتہ دستور میں درج بنیادی انسانی حقوق کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ زندگی کے حق کا مطلب کسب معاش بھی ہے یعنی جب تک کمائی نہ ہوگی تو زندگی بغیر کسی کمائی کے کیسے گزارا جاسکتی ہے لہذا کمائی زندگی کے لیے لازمی ہے۔ اور کمائی کرنے کے لیے لوگ ملازمت کرتے ہیں اگر ملازمت کے مقام پہ ایسا عمل جاری ہو کہ کسی کے ملازمت کرنے میں نخل ہو تو وہ ملازمت نہیں کر پائے گا اور یوں یہ زندگی کے حق کی تلفی ہوگی۔ لہذا مذکورہ قانون زندگی کا حق⁸¹ اور دوسرے اور دیگر بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے ہے اگر پرامن اور محفوظ ماحول میسر نہ ہو اور کوئی بھی روئے یا فعل کسی جگہ کا ماحول خراب کرتا ہو جس سے وہاں ملازمت کرنے والے مشکل محسوس کرتے ہوں تو یہ دستور میں درج بنیادی انسانی حقوق کے خلاف تصور ہو گا اور یہ ناقابل برداشت ہے۔

اسی طرح وقار کا حق جو کہ آئین کے آرٹیکل ۱۴⁸² میں مذکور ہے ایک ایسا حق ہے جو کسی بھی قیمت پہ انسان سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حق انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ حراسمنٹ سے انسان کی توقیر پہ زد پڑتی ہے جو کہ انسانی توقیر کے خلاف ہے اور یہ جرم ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم مرد و عورت میں حقوق کے حوالے سے کوئی فرق روانہ رکھے اور مساوات کی طرف سفر کریں۔ قوم کے قائد کے الفاظ بھی یہی تھے کہ کوئی بھی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ خواتین مردوں کے شامل بشانہ نہ کھڑی ہوں۔

اس کے بعد آخری دو پیرا گرافس میں عدالت کیس کے حقائق کی طرف واپس لوٹی ہے اور کہا ہے کہ صدر پاکستان نے مسنول علیہ کے سابقہ رویہ اور اخلاقی پن کو سامنے رکھا ہے اور اس کے خلاف پہلے سے ہی ایسی شکایات موجود ہیں اس کا رویہ حراسمنٹ کے حوالے سے سوالیہ نشان ہے لہذا حالات کا تقاضا ہے کہ اس کی سزا بڑھائی جائے نہ کہ گٹائی جائے۔ لہذا صدر پاکستان کے حکم کو واپس بحال کیا جاتا ہے لیکن جرمانے کو ڈھائی لاکھ نہیں بلکہ پانچ لاکھ کیا جاتا ہے اور مسنول علیہ ہر درخواست گزار خاتون کو پانچ لاکھ کا ہر جانہ ادا کرنے کا پابند ہوگا۔

وکیل کی طرف سے یہ گزارش کی گئی کہ دوران ملازمت مسنول علیہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور ملک سے باہر رہائش پزیر ہیں۔ لہذا ان حالات کی روشنی میں فیصلے کی نفاذ کی خاطر مسنول علیہ کی ملازمت سے برخاستگی کو جبری ریٹائرمنٹ میں تبدیل کیا جاتا ہے اگر وہ ہر جانہ ادا کرنے میں ناکام ہو تو ہر جانہ اس کی پنشن سے ادا کیا جائے گا۔

⁷⁹ Protection against Harassment of Women at Workplace Act, 2010.

⁸⁰ Any Person

⁸¹ Article 9. Security of person. No person shall be deprived of life or liberty save in accordance with law.

⁸² Article 14. Inviolability of dignity of man, etc. (1) The dignity of man and, subject to law, the privacy of home, shall be inviolable,

توہینِ مذہب کے ایک مقدمے میں لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد⁸³

حقائق:

مقدمے کے حقائق کچھ اس طرح ہیں کہ سہراب والا، تحصیل و ضلع میانوالی، میں ایک شخص نصر اللہ خان کے خلاف ۳۰ اگست ۲۰۲۱ کو ایک ایف آئی آر درج کی گئی جس میں قرار دیا گیا تھا کہ ملزم نے مختلف مواقع پر دعوے کیے ہیں کہ اس نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ کو بھی دیکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھا ہے اور اس کے اس طرح کے دعووں سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ (ایف آئی آر نمبر ۷۳۳۷ آف ۲۰۲۱ء مورخہ ۳۰ اگست ۲۰۲۱ء) چنانچہ اس کے خلاف مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۹-اے کے تحت مقدمہ درج کر کے پولیس نے تفتیش شروع کر دی۔ ملزم نے اس ایف آئی آر کو کالعدم کرنے اور مقدمہ ختم کرنے کے لیے ہائی کورٹ میں رٹ درخواست دائر کر دی جس پر لاہور ہائی کورٹ کے ایک رکنی بینچ نے کیس کی سماعت کے بعد یہ درخواست منظور کر کے اس کے خلاف مقدمہ ختم کرنے کا حکم دیا ہے (رٹ درخواست نمبر ۶۰۲۳۱ آف ۲۰۲۱ء، نصر اللہ بنام ایس ایچ او، تھانہ صد، میانوالی)۔

سیشن کی عدالت کے بجائے ہائی کورٹ کیوں؟

آگے بڑھنے سے قبل اس سوال کا جواب ضروری ہے کہ ملزم نے عام طریقہ اختیار کرنے کے بجائے رٹ درخواست کاراستہ کیوں چنا؟ عام طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے خلاف مقدمے میں سیشن کی عدالت میں اپنا دفاع کرتا اور ایسی صورت میں استغاثہ پر لازم ہوتا کہ وہ اس کے خلاف جرم ثابت کرے، اور جرم ثابت نہ کر سکنے کی صورت میں سیشن کی عدالت اسے بری کر دیتی۔ تاہم اس نے سیشن کی عدالت میں مقدمہ لڑنے اور اپنا دفاع کرنے کے بجائے ہائی کورٹ کا رخ کیا اور براہ راست وہاں درخواست دائر کر کے ایف آئی آر ہی ختم کرنے کی استدعا کر دی۔

جہاں تک مقدمہ ختم کرنے کے لیے ہائی کورٹ میں رٹ درخواست کا تعلق ہے، استثنائی حالات میں یہ درخواست دائر کی جاسکتی ہے اور ہائی کورٹ مطمئن ہو، تو وہ استثنائی حالات میں مقدمہ ختم کرنے کا فیصلہ کر سکتی ہے، قبل اس کے کہ سیشن کی عدالت فیصلہ سنادے اور پھر اپیل ہائی کورٹ میں آجائے، لیکن اس سلسلے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ہائی کورٹ میں رٹ درخواست کی سماعت اور فوجداری عدالت میں فوجداری مقدمے کی سماعت میں فرق ہوتا ہے۔ ہائی کورٹ اس صورت میں ٹرائل کورٹ کے طور پر مقدمہ نہیں دیکھتی، بلکہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ ملزم کے وہ بنیادی حقوق تو متاثر نہیں ہو رہے جن کی ضمانت آئین میں دی گئی ہے۔ موجودہ مقدمے کے تناظر میں دیکھیں، تو ہائی کورٹ نے صرف یہ دیکھا تھا کہ منصفانہ سماعت کا حق تو متاثر نہیں ہو رہا؟ یعنی مثلاً کیا اسے دفاع کا مناسب موقع فراہم کیا جا رہا ہے یا نہیں؟ کیا اس کے دفاع کی راہ میں کوئی رکاوٹ ڈالی گئی ہے؟ کیا اسے اپنے خلاف ثبوت اور شواہد دیکھنے سے روکا گیا ہے؟ کیا اسے گواہوں پر جرح سے روکا گیا ہے؟ کیا اسے اپنی مرضی کا وکیل کرنے سے محروم رکھا گیا ہے؟ وغیرہ۔ باقی رہا یہ معاملہ کہ اس نے واقعتاً جرم کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں، یا اس کے خلاف ثبوت کس نوعیت کے ہیں، گواہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں؟ وغیرہ، تو یہ امور ہائی کورٹ اس رٹ درخواست کی سماعت کے موقع پر نہیں دیکھ سکتی تھی، نہ ہی ان امور پر وہ کوئی فیصلہ دے سکتی تھی۔ یہ امور تو اس کے سامنے تب آتے، جب سیشن کی عدالت ملزم کے خلاف فیصلہ کر کے اسے سزا سناتی اور پھر وہ اپیل میں ہائی کورٹ میں آتا۔ بد قسمتی سے موجودہ فیصلے میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس طارق سلیم شیخ نے رٹ درخواست اور اپیل میں فرق کو نظر انداز کر کے ان امور پر بھی بحث کی ہے اور ان پر حتمی رائے دی ہے جو اس مرحلے پر بحث میں نہیں آسکتے تھے۔

کہیں قانون کو حقوق کی خلاف ورزی کے لیے تو استعمال نہیں کیا جا رہا؟

یہ امور بحث میں کیوں آگئے اور جسٹس شیخ نے ان پر حتمی رائے دینی کیوں ضروری سمجھی؟ اس سوال کا جواب جسٹس شیخ نے فقرہ نمبر ۱۵ اور ۱۶ میں دیا ہے جو کچھ یوں ہے کہ اگر مقدمہ دائر کر کے قانونی کارروائی شروع کرنے کے نتیجے میں ایسی صورت بن جائے کہ قانونی طریق کار کا غلط استعمال کر کے ملزم کے ان بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہو جن کے تحفظ کی ضمانت آئین میں دی گئی ہے، تو پھر ہائی کورٹ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ سرے سے مقدمہ ہی ختم کر دے تاکہ ملزم کے بنیادی حقوق محفوظ ہو جائیں۔ موجودہ مقدمے میں ایسا کیا تھا، جس کی بنا پر جسٹس شیخ اس نتیجے پر پہنچے، اس پر آگے بحث آ رہی ہے، لیکن اس وقت اس بات پر توجہ کریں کہ اس فیصلے میں ہائی کورٹ نے ملزم کے خلاف

توہین مذہب کا مقدمہ ختم کرنے کا حکم تو دے دیا، لیکن اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروانے والے کے خلاف جھوٹا اور بے بنیاد مقدمہ دائر کرنے پر قانونی کارروائی شروع کرنے کا حکم نہیں دیا! سوال یہ ہے کہ جب آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ ملزم کے خلاف مقدمہ دائر کرنے والے دراصل قانونی طریق کار کا غلط استعمال کر رہے ہیں، تو ان کے خلاف کارروائی کا حکم آپ نے کیوں نہیں دیا؟ کیا آپ کے خیال میں ملزم کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ اس کے خلاف دائر مقدمہ ختم کر دیا جائے اور اس کے بعد اس کی مرضی کہ وہ ان لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کرے یا نہ کرنے جنھوں نے اس کے خلاف یہ مقدمہ دائر کیا تھا؟ یہ ہمارے عدالتی نظام کی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر نہ صرف یہ کہ انصاف نہیں ہو پاتا بلکہ مقدمات کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس پہلو پر مزید بحث کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

اب آئیے اس سوال پر کہ ہائی کورٹ اس نتیجے پر کیسے پہنچی کہ موجودہ مقدمے میں قانونی طریق کار کا غلط استعمال ہو رہا ہے؟ درخواست گزار (جو فوجداری مقدمے میں توہین مذہب کا ملزم تھا) کے وکیل کی بنیادی دلیل یہ تھی کہ ایف آئی آر میں یہ تو کہا گیا ہے کہ ملزم نے اللہ تعالیٰ کو اور رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ کو خواب میں دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ وہ ہوا میں اڑتا ہے، لیکن ان امور سے وہ جرم وجود میں نہیں ہوتا جس کا اس پر الزام ہے کیونکہ اس کے لیے ایسے الفاظ یا افعال کا ہونا ضروری ہے جو توہین آمیز ہوں، اور ایف آئی آر میں ایسے الفاظ یا افعال کا ذکر ہی نہیں ہے۔ دوسری طرف سرکار کی جانب سے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کا موقف یہ تھا کہ ملزم نے قصداً اور بدینتی کے ساتھ ایسی کہانیاں گھڑی ہیں جن سے لوگوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں اور یہ کہ اس کے خلاف گواہوں کے بیانات بھی باضابطہ طور پر ریکارڈ کیے جاسکے ہیں۔ ان امور کی بنا پر اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کی رائے یہ تھی کہ ملزم کے خلاف کافی ثبوت موجود ہیں اور مقدمہ ختم نہیں کرنا چاہیے بلکہ سیشن کی عدالت کو فیصلہ کرنے دینا چاہیے۔

دفعہ ۲۹۵-اے کی تعبیر و تشریح:

فریقین کے وکیلوں کے دلائل مختصر ذکر کرنے کے بعد جسٹس شیخ نے اپنا تجزیہ پاکستان میں توہین مذہب کے قانون کی تاریخ سے شروع کیا اور بتایا کہ ۱۸۶۰ء میں انگریزوں نے مجموعہ تعزیرات ہند کے نام سے جو قانون نافذ کیا، اس کے باب پندرہ میں توہین مذہب کی مختلف صورتوں کے متعلق دفعات ۲۹۵ تا ۲۹۸ شامل کی گئی تھیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان دفعات کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے کثیرالمد مذہب معاشرے میں مذہبی بنیاد پر دو گنا فساد کی روک تھام ہو۔ چنانچہ ان دفعات کے ساتھ بالعموم دفعہ ۱۵۳-اے بھی متعلق ہو جاتی تھی۔ تاہم یہ انتظام اس وقت ناکافی ثابت ہوا جب راج پال کی جانب سے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی پر مبنی کتاب کے متعلق لاہور ہائی کورٹ نے قرار دیا تھا کہ اس پر دفعہ ۱۵۳-اے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس موقع پر توہین مذہب کے باب میں دفعہ ۲۹۵-اے کا اضافہ کیا گیا جس میں قرار دیا گیا کہ اگر کسی نے قصداً اور بدینتی کے ساتھ اپنے الفاظ یا افعال سے کسی کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا، تو اس کو اس دفعہ کے تحت سزا دی جائے گی۔

اس کے بعد اس دفعہ کی تعبیر و تشریح کے لیے جسٹس شیخ نے بھارتی مصنفین، ایک انگریز مصنف اور ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائی سے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلوں سے طویل اقتباسات پیش کیے ہیں اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ موجودہ مقدمے کے حقائق پر دفعہ ۲۹۵-اے کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ اس مقدمے میں ملزم کے خلاف ایسا کوئی الزام نہیں ہے کہ اس نے خواب وغیرہ کے جو دعویٰ کیے تھے وہ اس نے قصداً اور بدینتی کے ساتھ کسی کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے لیے کیے تھے۔ یہ بات انتہائی حیران کن ہے کیونکہ ابھی تو سیشن کی عدالت میں مقدمہ جاری تھا، استغاثہ کے دو گواہوں کے بیانات بھی ریکارڈ کیے جاسکے تھے اور انھوں نے دیگر امور کے علاوہ مذہبی جذبات مجروح کرنے کی بات خصوصاً کی تھی۔ ایسے میں سوال صرف یہ باقی رہتا تھا کہ کیا ملزم نے مذہبی جذبات قصداً مجروح کیے اور یہ کہ کیا اس نے ایسا بدینتی سے کیا؟ قانونی اصطلاح میں کیا قصداً مجرمانہ⁸⁴ کا عنصر موجود تھا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب مقدمے کی سماعت پوری ہونے سے قبل صرف ایف آئی آر دیکھ کر کیسے دیا جاسکتا تھا؟

مقدمہ ختم کرنے کا حکم کیوں دیا گیا؟

ایک لمحے کے لیے مان لیجیے کہ واقعتاً اس عنصر کی موجودگی کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا اور اس بنا پر جسٹس شیخ نے نتیجہ نکالا کہ دفعہ ۲۹۵-اے کا اطلاق نہیں ہوتا اور مقدمہ ختم کر دینا چاہیے، تو فیصلہ یہیں پر ختم کر دینا چاہیے تھا، لیکن جسٹس شیخ نے آگے بڑھ کر ان امور پر بھی تفصیلی رائے دی جس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں تھی۔ مثلاً انھوں نے دو صفحات اس بات کی توضیح میں لکھے کہ خواب ہوتے کیا ہیں، انسان خواب کیوں دیکھتے ہیں، خواب کا کوئی مطلب بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ انھوں نے اس ضمن میں سگنڈ فرینڈ، کارل یونگ، ایلن ہو بس اور رابرٹ میکالے کی آرا ذکر کی ہیں اور آخر میں نتیجہ یہ نکالا ہے کہ کسی شخص پر اس بنا پر مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے خواب میں کیا دیکھا ہے! سوال یہ

⁸⁴ Mens Rea: the intention or knowledge of wrongdoing that constitutes part of a crime, as opposed to the action or conduct of the accused.

ہے کہ کیا جسٹس صاحب بھول گئے تھے کہ ملزم پر مقدمہ اس وجہ سے دائر نہیں کیا گیا تھا کہ اس نے خواب میں کیا دیکھا ہے، بلکہ اس بنا پر قائم کیا گیا تھا کہ وہ اپنے خواب دعووں کی صورت میں بیان کر کے لوگوں کے مذہبی جذبات مجروح کرتا ہے؟

بہر حال، مقدمہ ختم کرنے کا حکم دینے کی وجہ یہ ہو کہ ملزم کے لیے قصد مجرمانہ کا عنصر ثابت نہیں کیا جاسکا یا یہ کہ خواب میں جو کچھ بھی دیکھا جائے اس کی بنا پر کسی پر مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا، یہ دونوں بنیادیں نہایت کمزور ہیں۔ پہلی بنیاد اس وجہ سے کمزور ہے کہ اس کا فیصلہ ثبوت اور شواہد دیکھنے کے بعد سیشن کی عدالت ہی کر سکتی تھی یا پھر اس کے خلاف ایبل ہائی کورٹ میں آتی، تو اس وقت ہائی کورٹ کر لیتی؛ موجودہ مقدمے میں جب ابھی ثبوت اور شواہد ہائی کورٹ نے دیکھے ہی نہیں تو وہ اس بنیاد پر فیصلہ کیسے کر سکتی تھی؟ دوسری بنیاد اس کے لیے کمزور ہے کہ ملزم پر مقدمہ اس بنا پر نہیں دائر کیا گیا تھا کہ اس نے خواب میں کیا کچھ دیکھا ہے، بلکہ اس بنا پر قائم کیا گیا تھا کہ وہ اپنے خوابوں کو دعووں کی صورت میں پیش کر کے دوسروں کے مذہبی جذبات مجروح کرتا ہے۔

پھر بھی اگر ان دو بنیادوں پر ہائی کورٹ صرف مقدمہ خارج کرنے کے حکم تک محدود رہتی، تو یہ کئی دیگر کمزور فیصلوں کی طرح ایک عام سا کمزور فیصلہ ہوتا، لیکن جسٹس شیخ نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا، بلکہ آگے بڑھ کر ایک اور مسئلے پر بھی رائے دی ہے اور اس رائے کو بنیاد بنا کر حکم بھی جاری کیا ہے۔ اس پر بحث ضروری ہے۔

مجرم یا نفسیاتی مریض؟

جسٹس شیخ نے ایک اور مصنف کی رائے پر اٹھار کر تے ہوئے لکھا ہے کہ مختلف نفسیاتی امراض کا شخص بعض اوقات گستاخانہ الفاظ بولتا ہے یا ایسے افعال کا ارتکاب کرتا ہے جنہیں توہین مذہب کہا جاسکتا ہے۔ ایسے مریضوں کو علاج کی ضرورت ہوتی ہے، نہ کہ انہیں سزا دینے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بعد ایک دفعہ پھر انہوں نے منصفانہ سماعت کے بنیادی حق کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ منصفانہ سماعت کے حق میں پولیس کی جانب سے مناسب تفتیش بھی شامل ہے۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ تفتیش غیر جانب دارانہ اور غیر متعصبانہ ہونی چاہیے۔ ان امور کے لیے انہوں نے ایک دفعہ پھر بھارتی عدالت کے فیصلے پر اٹھار کیا ہے حالانکہ ہمارے ہاں اس موضوع پر عدالتی نظائر کی کمی نہیں ہے۔ بہر حال ان امور پر بنا کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ پاکستان کے قانون کی رو سے ذہنی امراض کے شکار افراد کو تحفظ حاصل ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے خصوصاً دو قوانین کا حوالہ دیا ہے۔ ایک مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۸۴ اور دوسری ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۴۶۳۔ انہوں نے لاہور ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی قرار دیا کہ اگر ملزم یا اس کے وکیل کی جانب سے دماغی صحت کا عذر نہ بھی پیش کیا جائے، تب بھی عدالت کو خود اس بات کا نوٹس لینا چاہیے۔ اس کے ساتھ انہوں نے عالمی تنظیم صحت کے حوالے سے لکھا ہے کہ پاکستان میں ۴۳ فی صد یعنی تقریباً ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ افراد ذہنی امراض کا شکار ہیں۔ ان ساری باتوں سے انہوں نے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ جب بھی پولیس کسی جرم کی تفتیش کرے، اور بالخصوص جب وہ توہین مذہب کے باب کے تحت کسی جرم کی تفتیش کرے، تو اس پر لازم ہے کہ وہ پہلے ملزم کا دماغی معائنہ کروا کر متعین کرے کہ اس کی ذہنی حالت درست ہے یا نہیں۔

فاضل جسٹس صاحب کے اس حکم پر میرے دو سوالات ہیں۔ ایک یہ کہ جب ان کے سامنے مقدمے میں درخواست گزار نے سرے سے ذہنی مریض ہونے کا عذر پیش ہی نہیں کیا، نہ ہی اس کا ثبوت پیش کیا، نہ ہی اس دعوے اور ثبوت کے خلاف دوسرے فریق کے دلائل یا شواہد سنے گئے، تو وہ اس سوال پر فیصلہ کر کے حکم کیسے دے سکتے تھے؟ آخر کیوں ہمارے بعض فاضل جج صاحبان موقع نکال کر ان سوالات کو اپنے فیصلے میں شامل کر لیتے ہیں جو مقدمے میں ہوتے ہی نہیں ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ وہ سوالات ان کی اپنی کسی پرانی ذہنی الجھن سے متعلق ہوتے ہیں اور اب انہوں نے موقع نکال کر اس الجھن پر اپنی رائے حکم کی صورت میں دوسروں پر لازم کرنا ضروری سمجھا؟ جج صاحبان کا کوئی بھی مذہبی یا لبرل نظریہ ہو سکتا ہے لیکن مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے انہیں انھی قانونی سوالات تک محدود رہنا پڑے گا جو مقدمے میں ان کے سامنے آئے اور جن پر فریقین کی جانب سے دلائل اور شواہد پیش کیے گئے۔ اپنا نظریاتی ایجنڈا آگے بڑھانے کے لیے اپنے منصب کا استعمال جج صاحبان کے لیے مناسب نہیں ہے۔

دوسرا سوال اس سے زیادہ اہم ہے کہ ذہنی بیماری کا عذر ہو، ذاتی دفاع کا عذر ہو، اکراہ اور زبردستی کا عذر ہو، یا کوئی اور قانونی عذر، یہ سارے عذر استثنائی حیثیت رکھتے ہیں اور استثنائاً بار ثبوت اسی پر ہوتا ہے جو قانون سے اپنے لیے استثنائاً دعویٰ کرتا ہے۔ مثلاً الف نے ب کو قتل کر دیا لیکن الف کا کہنا یہ ہے کہ اس نے یہ قتل ذاتی دفاع میں کیا ہے، تو یہ ثابت کرنا اس کی ذمہ داری ہوگی اور اگر وہ یہ ثابت نہیں کر سکا، تو اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ یقیناً "ملزم قانون کا محبوب فرزند ہوتا ہے" اور اس وجہ سے الف پر ب کو قتل ثابت کرنا استغاثہ کی ذمہ داری ہوگی، لیکن جرم ثابت ہو جائے (خواہ استغاثہ نے ثبوت پیش کیا ہو یا ملزم نے خود ہی آزادانہ اقرار کیا ہو)، تو اس کے بعد ملزم کی حیثیت مجرم کی ہو جاتی ہے اور اگر اس کا دعویٰ ہے کہ جرم کے باوجود اسے سزا سے استثنائاً حاصل ہے، تو اس استثنائاً ثابت کرنا اس کی ذمہ داری ہوگی۔ فاضل جسٹس صاحب نے مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۸۴

کا حوالہ تو دیا لیکن پتہ نہیں کیوں ان کی توجہ اسے طرف نہیں گئی کہ یہ دفعہ جس باب میں ہے اس کا عنوان ہے: "عمومی استثناءات! ان کو عمومی استثناءات اس لیے کہتے ہیں کہ یہ تمام جرائم کی سزا سے بچنے کے لیے پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن یہ استثناءات ہی۔ (بعض جرائم کے لیے مخصوص استثناءات بھی موجود ہیں، جیسے باپ نے بیٹے کو قتل کیا، تو باپ سے قصاص نہیں لیا جاسکتا۔)

فیصلے میں کیا نہیں ہے؟

یہاں تک تو ان امور پر بحث ہوئی، جو اس فیصلے میں مذکور ہیں۔ اس کے بعد آخر میں ہم ان امور کا ذکر کریں گے جو اس فیصلے میں مذکور نہیں ہیں حالانکہ ان کا ذکر بہت ضروری تھا اور وہ موجود ہوتے، تو شاید فیصلہ مختلف ہوتا، یا کم از کم اس میں وہ کمزور یا نہ ہوتے جن کا یہاں ذکر کیا گیا۔

جسٹس شیخ نے، جیسا کہ ذکر ہوا، اس فیصلے میں پاکستان سے کیا دیگر ممالک سے بھی عدالتی نظائر پیش کیے، قانونی دلائل کے علاوہ سگمنڈ فرانڈ، کارل یونگ اور دیگر ماہرین نفسیات کی آرا بھی ذکر کیں، خوابوں کے تجزیے بھی کیے، سب کچھ کیا، لیکن جس بات کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا، وہ یہ ہے کہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک عدالت کے جج ہیں، ایک ایسے ملک میں جس کا آئین اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اعلان سے شروع ہوتا ہے، جس کے آئین میں تصریح کی گئی ہے کہ یہاں کوئی قانون اسلامی شریعت سے متضاد نہیں بنایا جائے گا اور تمام موجودہ قوانین کو اسلامی شریعت سے ہم آہنگ بنایا جائے گا، اور جس کے قانونی نظام میں صراحت سے کہا گیا ہے کہ عدالتیں قانون کی تعبیر و تشریح کرتے ہوئے اسلامی شریعت کے اصولوں سے ہم آہنگ تعبیر و تشریح اپنائیں گی۔ عام قوانین اور عام مقدمات میں بھی یہ ذمہ داری عدالتوں پر ہے (دیکھیے، قانون نفاذ شریعت ۱۹۹۱ء کی دفعہ ۳)، لیکن بالخصوص یہاں تو مقدمہ ہی تو بین مذہب کا تھا۔ کیا جسٹس صاحب کو قانون کی تعبیر کرتے ہوئے "قرآن و سنت میں مذکور احکام اسلام" (دیکھیے، آئین کی دفعہ ۲۲) کی طرف رجوع کر کے یہ دیکھنا نہیں چاہیے تھا کہ کیا ان احکام کی رو سے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا دعویٰ کرنا یا صحابہ کرام کو دیکھنے کا دعویٰ کرنا اور پھر لوگوں میں اس بیان کرنا قابل سزا جرم بنتا ہے یا نہیں؟ اگر ہاں، تو کن صورتوں میں، اور اگر نہیں، تو کیوں نہیں؟ اسی طرح کیا جسٹس صاحب کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ سگمنڈ فرانڈ اور کارل یونگ کے تجزیے پیش کرنے سے قبل یہ دیکھتے کہ قرآن و حدیث میں خوابوں کی کتنی قسمیں ذکر ہوئی ہیں؟ خوابوں کے متعلق آیات و احادیث کی تشریح مسلمان اہل علم مفسرین، محدثین، فقہاء، اصولیین اور متکلمین نے کیسے کی ہے؟ خواب اور الہام کا کیا تعلق ہے؟ سچے خواب کیا ہوتے ہیں؟ ان کی تعبیر کیسے پیش کی جاتی ہے؟ ان امور پر بحث کیے بغیر کیسے آپ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں کے ہاں کوئی خواب میں اللہ تعالیٰ کو یا صحابہ کرام کو دیکھنے کا دعویٰ کرتا ہے، اور یہ دعویٰ وہ لوگوں کے سامنے کرتا ہے، تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟

میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ خوابوں کی حقیقت کے متعلق جدید دور کے مباحث کی طرف توجہ نہ کریں، لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں اور مسلمانوں کے سماج میں کسی عمل کا مفہوم متعین کرنے کے لیے مسلمانوں کے علوم کو ہمارے جج صاحبان درخور اعتنائیوں نہیں سمجھتے، بالخصوص جبکہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں قانون کی تعبیر ان کی آئینی اور قانونی ذمہ داری بھی ہے؟

زنا بالجبر (ریپ) کے مقدمات میں تاخیر، ڈی این اے ٹیسٹ کا نہ ہونا اور ناقص تفتیش
ملزم کی بریت کی بنیاد نہ ہونے پر عدالت عظمیٰ کا اہم فیصلہ⁸⁵
عاقب فاروق⁸⁶

⁸⁵ Case Citation: Jail Petition No. 324 of 2019 and case title: "Irfan Ali sher Vs the State.

⁸⁶ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں قانون کے چوتھے سمسٹر کے طالب علم ہیں۔

زیر غور جیل درخواست میں عدالت عظمیٰ کے دور کئی بیچ کے سامنے تین بنیادی قانونی مسائل زیر غور تھے۔ ایک یہ کہ زنا بالجبر (ریپ) کے مقدمات میں ایف آئی آر اور پٹی معائنہ میں تاخیر کا کیس پر کیا اثر ہوگا۔ دوسرا کہ کیاریپ کیس میں ڈی این اے ٹیسٹ کے بغیر ملزم کو سزا ہو سکتی ہے۔ تیسرا مسئلہ جو زیر غور تھا وہ یہ کہ کیا تفتیشی افسر کی ناقص تفتیش ملزم کے لیے ریلیف کی بنیاد بن سکتی ہے۔

معاملہ کچھ یوں ہے کہ مدعی پر ۱۵ ستمبر ۲۰۱۳ کو مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۶۵-بی اور ۳۷۱ کے تحت تھانہ صدر قصور میں ایف آئی آر درج ہوئی کہ عرفان علی شیر (مدعی) نے پندرہ سالہ نابالغ لڑکی، جو کہ مدعی کی شاگردہ ہے، کو اغوا کر کے اس کے ساتھ جنسی زیادتی [زنا بالجبر] کی ہے۔ ٹرائل کورٹ نے دفعہ ۳۶۵-بی کے الزام سے تو مدعی کو بری کر دیا لیکن دفعہ ۳۷۱ کے تحت زنا بالجبر کے جرم میں چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۳۸۲-بی کے تحت سزا سنائے جانے سے پہلے جتنا عرصہ مدعی نے جیل میں گزارا تھا وہ ۱۴ سال کی سزا میں سے نکال دیا گیا۔

ٹرائل کورٹ کے فیصلہ سے ناخوش مدعی نے لاہور عدالت عالیہ میں اپیل دائر کی۔ عدالت عالیہ نے چودہ سال کی قید بامشقت کو کم کر کے دس سال کر دیا۔ عدالت عالیہ سے جزیوی ریلیف ملنے کے باوجود مدعی نے عدالت عالیہ کے فیصلہ کے خلاف اپیل کرتے ہوئے زیر بحث جیل درخواست فائل کی کہ اس کی دس سال کی سزا بھی ختم کی جائے۔ مدعی کے وکیل نے سزا کے خاتمے / معطلی کے لیے دلائل دیتے ہوئے مندرجہ ذیل نکات پر انحصار کیا:

- i. ایف آئی آر وقوع سے ایک دن کی تاخیر کے بعد درج ہوئی۔
- ii. ڈی این اے رپورٹ حاصل نہ کی گئی۔
- iii. متاثرہ لڑکی اور اس کے والدین پہلے بھی اس نوعیت کے کیس درج کروا چکے ہیں۔
- iv. وقوع کے وقت لڑکی نے جو کپڑے پہن رکھے تھے، وہ تفتیشی افسر کے حوالے نہ کیے گئے۔
- v. متاثرہ لڑکی کا طبی معائنہ وقوع سے کچھ دن کی تاخیر کے بعد ۱۵ ستمبر ۲۰۱۳ کو کروایا گیا جبکہ وقوع ۱۵ ستمبر ۲۰۱۳ کو ہوا تھا۔

آرڈر تحریر کرتے ہوئے مصنف جج، جسٹس قاضی فائز عیسیٰ، نے متذکرہ بالا قانونی مسائل پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھا کہ زنا بالجبر متاثرہ خاندان کے لیے ایک اذیت ناک واقعہ ہوتا ہے، ذہنی اذیت اور بدنامی کے ڈر سے اکثر ایسے معاملات میں قانونی کارروائی کا آغاز کرنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ لہذا ایف آئی آر درج ہونے کے حوالے سے تاخیر کا اس نوعیت (یعنی جنسی زیادتی / زنا بالجبر) کے کیس پر کوئی اثر نہیں۔ اس نکتے پر جسٹس صاحب نے دو کیسز⁸⁷ کا حوالہ دیا۔

ڈی این اے ٹیسٹ کے حوالے سے جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے ایک اہم نکتہ یہ واضح کیا کہ ریپ کیس میں متاثرہ لڑکی سے حاصل کردہ مردانہ نطفہ کا ملزم (جو اس درخواست کا مدعی ہے) سے تعلق ثابت کرنے کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کروانا قانون میں لازم نہیں ہے۔ ساتھ ہی جسٹس صاحب نے فرانزک سائنس کے اصول کا حوالہ دیا کہ اگر متاثرہ لڑکی کا طبی معائنہ جنسی زیادتی (ریپ) کے ۳۸ گھنٹے بعد ہو تو نطفہ حاصل کرنا اور اس کا فرانزک معائنہ کرنا ممکن نہیں رہتا اور اس کیس میں بھی متاثرہ لڑکی کا طبی معائنہ ۳۸ گھنٹے سے زیادہ کے وقفہ سے ہوا تھا۔ ڈاکٹر عائشہ ناصر [پی۔ ڈبلیو ۹] نے متاثرہ لڑکی کا طبی معائنہ کیا اور طبی قانونی سرٹیفکیٹ⁸⁸ جاری کیا، جس میں لکھا تھا کہ متاثرہ لڑکی کی خاص جھلی⁸⁹ حال ہی میں ٹوٹی ہے اور جسم کے مخصوص حصوں میں خون کے تازہ شواہد ملے ہیں یعنی یہ بات واضح تھی کہ لڑکی کے ساتھ وقوع کے دن کے قریب قریب جنسی تعلق قائم کیا گیا تھا۔

جرح کے دوران بھی ڈاکٹر صاحبہ نے میڈیکولاجی سرٹیفکیٹ سے مطابقت میں جواب دیے۔ یہاں یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ اگر ڈی این اے ٹیسٹ کے بغیر صرف میڈیکولاجی سرٹیفکیٹ اور طبی معائنہ کرنے والی ڈاکٹر کی گواہی سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ متاثرہ لڑکی کے ساتھ جنسی تعلق قائم کیا گیا ہے تو زنا بالجبر (ریپ) کے مقدمے میں ملزم (جو اس درخواست کا مدعی ہے) کو سزا ہو سکتی ہے۔ متاثر لڑکی، جس نے [پی۔ ڈبلیو ۱] کے طور پر گواہی دی، اور اس کی والدہ [پی۔ ڈبلیو ۶] نے جرح میں کوئی ایسا جواب نہ دیا کہ جس سے مدعی کو فائدہ ہو سکے۔ مدعی کی جانب سے اس بات کا بھی کوئی معقول جواب نہ دیا گیا کہ کوئی طالبہ اپنے استاذ کے خلاف ایسا سنگین الزام کیوں لگائے گی۔

⁸⁷ 2008 SCMR 1602, PLD 2011 SC 554.

⁸⁸ Medico - Legal Certificate also called as MLC is required in cases of accident or an incident which has led to injury or death.

⁸⁹ Hymen: It is a thin piece of tissue located at the opening of the vagina.

یہاں زیر بحث قانونی سوالات کے ساتھ ساتھ ایک ضمنی مسئلہ کو واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ ہمارے ہاں اکثر فوجداری مقدمات کے درخواست گزار اور گواہان سے جرح کے دوران فریق مخالف کے دکلاء زیر ٹرائل وقوعہ کے علاوہ دیگر ایف آئی آر کی بابت سوالات کرتے ہیں۔ اس کا مقصد درخواست گزار کے کیس کو نقصان پہنچا کر ریلیف حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن جن ایف آئی آر کی بابت جرح میں سوال کیا جاتا ہے، وہ نہ تو عدالت میں پیش کر کے ریکارڈ کا حصہ بنائی جاتی ہیں اور نہ ہی دوران جرح درخواست گزار اور دیگر گواہان کا ان ایف آئی آر سے سامنا کروایا جاتا ہے۔ اس کیس میں بھی یہ فوجداری دفاع ضرور لیا گیا کہ متاثرہ لڑکی کے والدین اس طرح کی (یعنی جنسی زیادتی/ریپ کی) ایف آئی آر درج کرواتے رہتے ہیں، لیکن دوران جرح متاثرہ لڑکی [پی۔ ڈبلیو ۱]، [پی۔ ڈبلیو ۶] اور [پی۔ ڈبلیو ۱۰] کا مذکورہ ایف آئی آر سے سامنا نہ کروایا گیا۔ لہذا جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے اس دفاع کو مکمل طور پر رد کیا۔ جسٹس صاحب کے اس عمل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دوران ٹرائل جرح کرتے وقت اگر وقوعہ کے علاوہ دیگر ایف آئی آر کا ذکر کیا جائے تو اس کا فائدہ صرف اس صورت میں ہے کہ ان کو عدالت میں پیش کر کے ریکارڈ کا حصہ بنایا جائے یا درخواست گزار و گواہان کا ان ایف آئی آر سے سامنا کروایا جائے، محض ان کی بابت سوال پوچھ کر کوئی ریلیف نہیں ملے گا۔ یہ فوجداری ٹرائل کے دکلاء کے لیے ایک اہم نکتہ ہے جسے اکثر اوقات نظر انداز کیا جاتا ہے۔

آخری قانونی مسئلہ جو زیر غور تھا وہ ناقص تفتیش کا تھا۔ اس حوالے سے جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے کہا کہ مدعی کے وکیل کا یہ اعتراض کہ تفتیش میں نقائص تھے اور متاثرہ لڑکی کے کپڑے تفتیشی افسر کو نہ دیے گئے تھے بے بنیاد ہے کیوں کہ عین ممکن ہے کہ ذہنی کرب اور اپنی عفت کی وجہ سے متاثرہ خاندان نے ایسا نہ کیا ہو گا۔ یہ تفتیشی افسر کی ذمہ داری تھی کہ خود ہر ضروری شے متاثرہ خاندان سے طلب کرتا۔ جسٹس صاحب نے کہا کہ تفتیشی افسر کی ناقص تفتیش کی وجہ سے متاثرہ لڑکی کے ساتھ زیادتی نہیں کی جاسکتی۔ ساتھ ہی یہ بات بیان کی گئی کہ اس مقدمہ کی تفتیش مرد تفتیشی افسر نے کی ہے۔ یہاں ایک اہم ہدایت کی گئی کہ جنسی زیادتی/زنا بالجبر (ریپ) کے مقدمات کی تفتیش خاتون تفتیشی افسر کو کرنی چاہیے تاکہ متاثرہ خاتون کے تقدس کی حفاظت ہو سکے۔ اس ضمن میں جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے پنجاب پولیس کی جانب سے جاری کردہ عصمت دری کے مقدمات کا معیاری طریقہ کار⁹⁰ کی شق ۲ [زبلی دفعہ ۳] اور شق ۳ مکمل فیصلے میں نقل کئے۔

آخر میں دور کئی بیٹھنے پر یہ کہتے ہوئے اپیل مسترد کر دی کہ پہلے ہی ٹرائل کورٹ نے سزا سنانے میں رعایت برتی ہے اور عدالت عالیہ نے بھی سزا کم کر دی ہے۔

منشیات کے کیسز کے طریقہ کار، پیر لاهور ہائی کورٹ ملتان کے دو سرکئی بیٹھنے کا اہم ترین فیصلہ⁹¹

محمد ذیشان حیات⁹²

کیس کے مختصر حقائق کچھ یوں ہیں۔

وہاڑی پولیس کو مخبر خاص کی طرف سے اطلاع دی جاتی ہے کہ یہاں وہاڑی میں ایک شخص ہے جس نے منشیات کا بازار گرم کر رکھا ہوا ہے اس اطلاع کی بابت پولیس فوری طور پر اس شخص کو پکڑنے پہنچ جاتی ہیں وہاں پر جب اس شخص کی تلاشی لی جاتی ہے تو اس کے جیب سے ۵۰ چھوٹے پیکٹ نکلتے ہیں جو ٹوٹل ۱۱ گرام ہیر وٹن پر مشتمل ہوتے ہیں اور مزید تلاشی لینے پر ملزم سے ۳ کلو اور ۹۷۰ گرام کیبل برآمد ہوتی ہے جو ہیر وٹن کی ہی طرح منشیات ہوتی ہے اور ساتھ میں ۳۳۸۰ پاکستانی روپے بھی برآمد ہوتے ہیں۔ ملزم گرفتاری کے دوران اپنا نام ندیم اختر ولد منظور احمد ضلع وہاڑی کارہائشی بتلاتا ہے۔

جس کے بعد مدعی پر امراسلہ⁹³ کی بنیاد پر ایف۔ آئی۔ آر درج کروادی جاتی ہے اور یہ سارا واقعہ ۱۹ دسمبر ۲۰۱۵ کو پیش آتا ہے۔ جسکے بابت ایف۔ آئی۔ آر نمبر ۲۰۱۵/۵۶۰ تھانے میں درج کی جاتی ہے۔ تفتیش کے لیے سب انسپکٹر الطاف حسین کو مقرر کیا جاتا ہے اس کے بعد تفتیشی افسر تمام گواہوں کے بیانات قلمبند کرتا ہے۔ اور اس مقدمے کا مکمل چالان

⁹⁰ Standard Operating Procedure of Rape Cases

⁹¹ This important appeal was written by Justice Ali Zia Bajwa and can be searched as 2022 C.R.C. 492[D.B].

⁹² ایڈووکیٹ، ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نوشہرہ، خیبر پختونخواہ۔

⁹³ لفظ امراسلہ خیبر پختونخواہ میں زیادہ تر استعمال ہوتا ہے جبکہ پنجاب وغیرہ میں لفظ کمپلیٹ استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۰۱۶ء کو عدالت میں جمع کیا جاتا ہے جس کے بعد ملزم کا ٹرائل شروع ہو جاتا ہے۔ ٹرائل چلنے کے بعد ایڈیشنل سیشن جج، وٹائی ۲۱ فروری ۲۰۱۷ء کو ملزم کو ۸ سال کی قید اور ۷۰ ہزار روپے کے جرمانے کی سزا سناتا ہے اس کے بعد ملزم عدالت عالیہ میں ایڈیشنل سیشن جج کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کرتا ہے، اور ۱۱۳ اکتوبر ۲۰۲۱ء کو عدالت عالیہ اس اپیل کو سنتی ہے۔

اس دوران عدالت کے علم میں ملزم کا وکیل یہ بات لاتا ہے کہ مدعی مقدمہ رشید احمد (انسپکٹر) نے جرح کے دوران بتلایا ہے کہ اس نے کیس پر اپرٹی انفیتیشی افسر الطاف حسین کے حوالے کی اور تفتیشی افسر الطاف حسین جرح کے دوران یہ بات بتلاتا ہے کہ مدعی مقدمہ رشید احمد (انسپکٹر) نے کیس پر اپرٹی کانسٹیبل غلام مصطفیٰ کے حوالے کی جو ایک تشویشناک شک پیدا کرتا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ غلام مصطفیٰ کو عدالت کے سامنے پیش بھی نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اس کا بیان⁹⁴ قلمبند کیا جاتا ہے۔

اسکے بعد عدالت عالیہ کہتی ہے کہ ملزم کو نار کوئٹس کے کیسز میں سزا کے لیے ضروری ہے کہ سیف کسٹڈی اور سیف ٹرائسٹیشن کو ثابت کیا جائے پھر عدالت عالیہ سیف کسٹڈی اور سیف ٹرائسٹیشن آف نار کوئٹس کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کے کچھ فیصلوں کا ذکر کرتی ہے جس میں قیصر خان کیس، ظاہر شاہ الیاس شاہ بنام سرکار⁹⁵ اور زبیر خان کیس شامل ہے۔ اس کے بعد عدالت اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے اور کہتی ہیں کہ اگر کیس میں شک پیدا ہو جائے تو اس کا فائدہ ضروری طور پر ملزم کو ملنا چاہیے وہ بھی بطور حق نہ کہ مہربانی کے طور پر اسکے بعد عدالت عالیہ اس پر بھی عدالت عظمیٰ کے کچھ فیصلوں کا ذکر کرتی ہے جس میں قیصر اللہ وغیرہ بنام سرکار⁹⁶ اور کامران شاہ وغیرہ بنام سرکار⁹⁷ شامل ہے۔

عدالت اخرا کار اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ پراسیکیوشن اپنا کیس شک سے بالاتر ثابت نہیں کر سکی لہذا عدالت عالیہ ٹرائل کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتی ہے اور ملزم کو رہا کرنے کا حکم صادر فرماتی ہیں۔ اس کے بعد عدالت عالیہ ساتھ میں اس بات پر بحث کرتی ہے کہ منشیات کے کیس میں کیا طریقہ کار اپنایا جائے اور پورا طریقہ درجہ بہ درجہ اس فیصلہ میں واضح کر دیتی ہے۔ سب سے پہلے جب کوئی پولیس افسر جس کا ریکرڈ ہیڈ کانسٹیبل کے ریکرڈ سے اوپر ہو جب وہ تھانے سے نکلے یا پھر جب تھانے واپس لوٹے تو وہ پولیس رجسٹر نمبر⁹⁸ جو پولیس رولز ۱۹۳۴ء کے مطابق قائم کیا گیا ہے اس میں اپنی انٹری لازمی یقینی بنانے کا اپنے آمد اور روانگی کے متعلق ماسوائے تفتیشی افسر کے۔ اور جب جب منشیات پکڑی جائے تو سب سے پہلے پارسل تجزیہ فرازنگ سائنس لیبارٹری کے لیے منشیات سے سمپل کوالگ کیا جائے گا اور بقایا کیس پر اپرٹی پر زمدار پولیس افسر اپنے نام کا مونو گرام لگائے گا اور اس کے بابت پولیس رجسٹر نمبر ۱۹ جسے سٹور روم رجسٹرڈ بھی کہا جاتا ہے اس میں انٹری کریگا اس کیس پر اپرٹی کے متعلق جولائی ہے۔ اس کے بعد تفتیشی افسر، پولیس اہلکاروں کے بیانات قلمبند کرے گا، جس کی تفصیل درج ذیل ہیں۔

- i. وہ شخصیات جو ریکوری کے گواہان ہو۔
- ii. وہ شخص جس نے کیس پر اپرٹی سے پارسل بنائے ہو۔
- iii. وہ شخص جو کیس پر اپرٹی کو کرائم سین سے سٹور روم تک لے کر گیا تاکہ سیف کسٹڈی برقرار رہے۔
- iv. وہ شخص جس نے کیس پر اپرٹی کو وصول کیا سیف کسٹڈی کو برقرار رکھنے کے لیے۔
- v. وہ شخص جس کو پارسل حوالہ کیا جائے تاکہ وہ اسے سائنس لیبارٹری تک لے کر جائے۔

مندرجہ بالا تمام زمداروں کے بیانات⁹⁹ قلمبند کرنا لازمی ہے اور انہیں عدالت کے سامنے بھی پیش کرنا ضروری ہیں، جب سمپل سائنس لیبارٹری کے لیے ڈاک کے ذریعے لے جایا جائے گا تو اس کے لیے رجسٹرڈ نمبر ۲۱ سے روڈ سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے گا اور اس سرٹیفکیٹ کو فائل کا حصہ بنانا ضروری ہے۔ وہ شخص جو مر اسلہ تھانہ لے کر جائے اور وہ شخص بھی جو اس مر اسلہ کے بابت ایف۔ آئی۔ آر کی چاکیدگی کریگا ان دونوں کا بھی عدالت کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد عدالت عالیہ اس جھجھٹ میں پراسیکیوشن پر یہ

⁹⁴ Section 161, The Code of Criminal Procedure, 1898.

⁹⁵ 2019 SCMR 2004

⁹⁶ 2009 SCMR 579

⁹⁷ 2019 SCMR 1217

⁹⁸ Roaznamcha or Daily Diary under The Police Rules, 1934.

⁹⁹ Section 161, The Code of Criminal Procedure, 1898.

زمنہ داری عائد کرتی ہے کہ کوئی بھی ایسا گواہ باقی نہ رہے جس کی سیف کسٹڈی کو ثابت کرنے کے لیے اسکا ہونا ضروری ہو۔ اس کے بعد عدالت عالیہ ٹرائل کورٹ پر بھی یہ ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ملزم سے ۳۴۲ مجموعہ ضابطہ فوجداری کا بیان ریکارڈ کرتے وقت خود کو مطمئن کرے کہ ہر قسم کا ثبوت ملزم کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔

منشیات کے کیسز میں ویڈیو گرافی کے استعمال پر پشاور عدالت عالیہ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ¹⁰¹

مدثر اقبال¹⁰¹

یہ کیس پشاور عدالت عالیہ کے جج محمد ابراہیم خان کے سامنے بطور فوجداری ضمانت¹⁰² کی درخواست کے طور پر پیش ہوا۔ کیس کے حقائق کچھ یوں ہیں کہ مدعی امداد اللہ کو پولیس نے مورخہ ۳۰ جولائی ۲۰۲۳ کو [کے پی کنزول نارکوٹکس سبڈیوژن ایکٹ ۲۰۱۹] کے دفعہ ۱۱(ب) کے تحت گرفتار کیا تھا۔ اس ایف آئی میں امداد اللہ کے تحویل سے ۸۰۳ گرام آئیس اور شریک ملزم زبیر سے ۷۰۷ گرام چرس برآمد ہوئے تھے۔ تاہم اس سے ایک دن پہلے مدعی پر اسی تھانہ میں ایک اور ایف آئی آر زیر دفعہ ۳۸۰/۴۵ مجموعہ تعزیرات پاکستان درج ہوئی تھی۔ اس پرائیڈیشنل سیشن جج نے اس کی ضمانت بعد از گرفتاری کی درخواست کینسل کی تھی۔ جس پر مدعی نے یہ درخواست دائر کی۔

عدالت عالیہ کے سامنے اس کیس کے متعلق کچھ مزید حقائق سامنے آئے جیسے یہ کہ مدعی اور اس کے ساتھ شریک ملزم پر چوری کی ایف آئی آر بھی ہوئی تھی، جس میں دونوں فریقین کے درمیان صلح ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کے وکیل نے ان دونوں ملزمان کی حراست کو زیر دفعہ ۴۹۱ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت چیلنج بھی کیا تھا۔ کیس کے حقائق معلوم کرنے کے لیے [سیزننگ آفیسر] اور [ایس۔ ایچ۔ او] کو بھی عدالت بلایا گیا لیکن انہوں نے کوئی حقائق پیش نہیں کئے۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر [ڈی۔ پی۔ او] چار سہہ کو عدالت بلایا گیا۔ جس کی ہدایت پر پولیس رپورٹ¹⁰⁴ جمع کی گئی جسے عدالت نے مکمل قرار دیا۔ ملزمان کے وکیل نے پولیس پر ۳۵ ہزار روپے بطور رشوت لینے اور معصوم ملزمان کو غلط کیس میں شامل کرنے کا الزام عائد کیا۔ پہلے الزام کے ثبوت ناہونے کی وجہ سے ختم کیا گیا۔ جبکہ دوسرا الزام عدالت نے صحیح قرار دے دیا۔ اس کے بعد عدالت نے منشیات کے روک تھام کیلئے پولیس کے ذمہ داری پر بحث کی اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ منشیات کے کیسز میں پولیس پر ایسیٹیٹ گواہوں¹⁰⁵ کے بیان ریکارڈ نہیں کرتی۔ عدالت نے پولیس کی بددیانتی کو روکنے کے لئے قانون شہادت کے آرٹیکل ۱۶۴ کو ریفر کیا اور کہا کہ پولیس کو اس آرٹیکل کا اچھا استعمال کرنا چاہیے۔ آرٹیکل ۱۶۴¹⁰⁶ کہتی ہے کہ جس کیس میں عدالت اجازت دے تو اس کیس میں ان شواہدات کو پیش کیا جاسکتا ہے جو جدید آلات کے ذریعے بنی ہو۔ اس کے بعد عدالت نے اس کے متعلق متعدد ججمنٹ کا حوالہ دیا۔

عدالت نے یہ کہا کہ پولیس کو منشیات کی ریکوری کے دوران ویڈیو گرافی کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس ویڈیو گرافی سے پولیس اور دیگر اداروں کے بے جا مداخلت اور بددیانتی ختم ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد عدالت نے مزید کہا کہ اگر کسی پولیس کے پاس ویڈیو کیمرے یا سمارٹ فون نہیں ہے تو پولیس ڈیپارٹمنٹ یا صوبائی حکومت اس کے لیے فنڈ مختص کرے گی تاکہ ریکوری کے تمام معاملات ریکارڈ ہو سکے۔

¹⁰⁰ This important judgement is written by Justice Muhammad Ibrahim Khan and can be searched and cited as 2023 KPLJ 563.

¹⁰¹ طالب علم، شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

¹⁰² Criminal Miscellaneous Bail application

¹⁰³ Khyber Pakhtunkhwa Control of Narcotic Substances Act, 2019

¹⁰⁴ Section 173 of The Code of Criminal Procedure, 1898

¹⁰⁵ A private witness is someone who was a witness to the occurring of the crime scene.

¹⁰⁶ **164. Production of evidence that has become available because of modern devices, etc.** In such cases as the Court may consider appropriate, the Court may allow to be produced any evidence that may have become available because of modern devices or techniques. Provided that conviction based on modern devices or techniques may be lawful.

آخر میں عدالت نے ملزم کے ضمانت کی درخواست کو منظور کر لیا گیا اور ساتھ میں ایک لاکھ روپے کے محکمے سے دو ضمانتیوں کے جمع کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

ڈاکٹران آف اکیڈمی فیلڈ¹⁰⁷ کے حوالے سے پشاور عدالت عالیہ مینگو مہ بلینچ کا ایک اہم فیصلہ¹⁰⁸ ذوالقرنین ایڈووکیٹ¹⁰⁹

مختصر حقائق:

تاقب احمد نام کا ایک مدعی اپنی ۱۱-۱۲ سال کی بیٹی کلثوم کے ساتھ ۲۱ اپریل ۲۰۱۸ کو پولیس سٹیشن جا کر کچھ یوں رپورٹ کرتا ہے کہ وقوعہ کے دن اس کی بیٹی کلثوم جو کہ پانچویں جماعت کی طالبہ ہے کو سکول سے واپسی کے وقت ملزم مقبول حسین نے منہ میں دوپٹہ دبوچ کر اغوا کر کے قریبی جنگل میں لے جا کر زیادتی کا نشانہ بنایا۔ پولیس نے مدعی کا بیان سن کر ملزم پر مجموعہ تعزیرات پاکستان کے زیر دفعہ ۶، ۳، ۳۶۴ اور ۵۱۱ اور ساتھ میں چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر ایکٹ، ۲۰۱۰ کے زیر دفعہ ۵۱¹¹¹ ملزم پر ایف آئی آر درج کی۔ ایف آئی آر درج ہونے کے بعد کیس کا باقاعدہ آغاز جوینائل کورٹ چترال میں جوینائل جسٹس سسٹم کے تحت ہوا اور یہ جوینائل کورٹ میں اس لئے ہوا کیونکہ ملزم کی عمر ۱۸ سال سے کم تھی اور ایک لمبے ٹرائل کے بعد فاضل ایڈیشنل سیشن جج چترال نے ملزم مقبول کو مندرجہ ذیل سزا سنائی۔ مجموعہ تعزیرات پاکستان کے زیر دفعہ ۳۶۴ اور ۵۱۱ کے تحت دس سال قید بامشقت اور مبلغ پچاس ہزار روپے جرمانہ عائد کیا جو کہ زیادتی کے شکار بچی کے خاندان کو ادا کیا جائے گا۔ چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر ایکٹ، ۲۰۱۰ کے زیر دفعہ ۵۳ کے تحت سات سال قید بامشقت اور ساتھ میں ایک لاکھ روپے جرمانہ جو کہ زیادتی کے شکار بچی کے خاندان کو ادا کیا جائے گا۔ ان سزاؤں کے بارے میں یہ بھی ہدایات دی گئیں کہ یہ سزائیں ایک کے بعد ایک¹¹² دی جائیں گی۔

ملزم کی جانب سے مندرجہ بالا سزا کے خلاف ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۴۱۰ کے تحت پشاور عدالت عالیہ میں اپیل دائر کی گئی۔ اپیل میں دفعہ ۳۶۴ اور ۵۱۱ کے تحت دی جانے والی سزا کو قانونی قرار دے دیا گیا لیکن ساتھ میں مندرجہ بالا دفعات کے تحت دی جانے والی سزائیں کمی کر کے سات سال کی بجائے پانچ سال اور جرمانہ پچاس ہزار سے کم کر کے پچیس ہزار کیا گیا اور اس کمی کے لئے ملزم کا کم عمر ہونا اور پہلی دفعہ یہ جرم سرزد ہونا بتایا گیا۔

یہاں تک تو یہ فیصلہ بالکل ایک عام فیصلہ ہے لیکن اس کے بعد جسٹس صاحب نے مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۳۶۴ اور چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر ایکٹ، ۲۰۱۰ کے زیر دفعہ ۵۳ دی جانے والی سزا پر جو مفصل روشنی ڈالی ہے تو وہ بحث آج کل فیصلوں میں خال خال دیکھنے کو ملتی ہے جو کہ ذیل ہیں۔

جسٹس صاحب نے اپنے سامنے پہلا سوال چائلڈ پروٹیکشن ایکٹ کے زیر دفعہ ۵۳ دی جانے والی سزا کا رکھا ہے اور اس سزا کے حوالے سے جسٹس صاحب نے بحث کا آغاز دفعہ ۵۳¹¹³ کے الفاظ سے کیا ہے جس میں سیکشول ایبوز کی سزا درج ہے جو کہ کم سے کم ۷ سال اور زیادہ سے زیادہ ۱۴ سال اور ایک لاکھ روپے جرمانہ ہے۔ اس کے بعد جسٹس صاحب نے

¹⁰⁷ The Doctrine of Occupied field provides that if an Act of Parliament is occupying a subject over which the State Legislature is also empowered to legislate and has legislated, and the State's legislation obstructs the operation of the Parliament's Act then the State's legislation is repugnant or inconsistent with the parliament acts to the extent of provisions which obstructs the latter operation.

¹⁰⁸ This Important Judgement Can Be Searched and Cited as Criminal appeal No.271-M/2020.

¹⁰⁹ پشاور بار ایسوسی ایشن۔

¹¹⁰ The Khyber Pakhtunkhwa Child Protection and Welfare Act, 2010.

¹¹¹ **51. Abetting escape of child.** Whoever-(a) knowingly assists or induces, directly or indirectly, a child admitted to a Child Protection Institution, to escape from the institution; or (b) knowingly harbors, conceals, connives with, assists, or prevents a child from returning to a Child Protection, Institution or to any person to whom the protection of the child was entrusted by the Court. Shall be punished with rigorous imprisonment for a term which may extend to three years and shall also be liable to fine which may extend to fifty thousand rupees.

¹¹² Consecutive

¹¹³ **53. Sexual abuse.** Whoever commits an offence of sexual abuse shall be punished with imprisonment for life or a term which may extend to ten years which shall not be less than two years and shall also be liable to a fine which may extend to five million rupees.

چائلڈ پروٹیکشن ایکٹ کے دفعہ ۲ میں سیکشن ۱۱۴ کی تعریف بیان کی ہے۔ اس کے بعد جسٹس صاحب نے دفعہ ۵۳ میں موجود سیکشنل ایبوز اور مجموعہ تعزیرات پاکستان میں موجود دفعہ ۳۷۶ کا تقابل کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ چائلڈ پروٹیکشن ایکٹ ایک صوبائی قانون ہے اور مجموعہ تعزیرات پاکستان ایک وفاقی قانون ہے اور ساتھ میں یہ لکھا ہے کہ سیکشنل ایبوز اور ریپ ڈالگ الگ جرم ہیں اور دونوں کی سزائیں بھی الگ الگ ہیں۔ دونوں جرائم میں تقابل کے بعد جسٹس صاحب نے اس اہم نکتے کا آغاز کیا ہے جو اس پوسٹ کی وجہ بنیاد بنا۔ جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ دفعہ ۵۳ چائلڈ پروٹیکشن ایکٹ میں موجود سیکشنل ایبوز مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۳۷۶-۱ میں بھی ۲۰۱۶ سے متعارف کروایا گیا ہے اور پھر دفعہ ۳۷۶-۱ کے الفاظ نقل کر کے دفعہ ۵۳ چائلڈ پروٹیکشن ایکٹ کے سیکشنل ایبوز اور مجموعہ تعزیرات پاکستان کے سیکشنل ایبوز کا تقابل کر کے یہ لکھا ہے کہ دونوں کے تعریف میں کوئی خاص فرق نہیں ہے لیکن دونوں کی سزائوں میں فرق ہے۔ دفعہ ۳۷۶-۱ کے سزایاں زیادہ سے زیادہ سات سال قید اور پچاس ہزار روپے تک جرمانہ جب کہ دفعہ ۵۳ کی سزا چودہ سال تک قید اور ایک لاکھ روپے تک جرمانہ ہے۔ دونوں دفعات کی سزائیں فرق دراصل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صوبائی اور وفاقی قانون میں تنازع ہے اور اس تنازع کے حل کے لئے ڈاکٹر اے آف کو پائینڈ فیئلڈ یا ڈاکٹر اے آف ایگلپس کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر اے آف کو پائینڈ فیئلڈ کی بحث کا آغاز جسٹس صاحب نے آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۴۳¹¹⁶ سے کیا ہے جس میں صراحتاً یہ بات موجود ہے کہ صوبائی اور وفاقی قانون کے درمیان تنازع کی صورت میں وفاقی قانون کو فوقیت حاصل ہوگی۔ یہاں پر جسٹس صاحب نے سندھ عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ آف انڈیا کے فیصلوں کے حوالوں کے علاوہ عدالت عظمیٰ آف پاکستان کے فیصلوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ان کیس لازمی روشنی میں جسٹس صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ڈاکٹر اے آف کو پائینڈ فیئلڈ کی روشنی میں وفاقی قانون کو صوبائی قانون پر فوقیت حاصل ہے اور اس لئے ملزم کو چائلڈ پروٹیکشن ایکٹ کے دفعہ ۵۳ کی بجائے مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۳۷۶-۱ کے تحت سزا دی جائے۔ یہاں سے جسٹس صاحب نے ایک اور بحث کا آغاز کچھ یوں کیا ہے کہ دفعہ ۳۷۶ کی سزائیں بھی حال ہی میں ترمیم ہوئی ہے اور اس کی سزاسات سال سے بڑھا کر چودہ سال کر دی ہے لیکن چونکہ وقوعہ کے وقت اس جرم کی سزا کم تھی تو فوجداری قانون کو چونکہ ریٹرو سپیکٹو حیثیت حاصل نہیں ہوتی تو اس لئے ملزم کو دفعہ ۳۷۶ کے تحت کم سزا دی جائے گی جو کہ سات سال سے کم کر کے پانچ سال کی گئی اور جرمانہ بھی ایک لاکھ سے کم کر کے پچاس ہزار کیا گیا۔

وفاقی قانون اور صوبائی قانون کے درمیان تنازع کے مسئلہ کو ڈاکٹر اے آف کو پائینڈ فیئلڈ سے حل کرنے کے بعد جسٹس صاحب نے اپنے سامنے دوسرا سوال مجموعہ تعزیرات پاکستان کے زیر دفعہ ۳۶۴ کے تحت ملزم کو سزائی جانے والی سزا کا رکھا ہے اور اس بحث کا آغاز کچھ یوں کیا ہے کہ کیا موجودہ کیس کے حقائق کو دیکھ کر ان گواہ کے جرم کے اجراء کیا پورے ہوتے ہیں اور اس کے بعد جسٹس صاحب نے دفعہ ۱۳۶۴ اور کیس لازمی روشنی میں ان گواہ کے جرم کے اجراء پر تفصیلی بحث کر کے لکھا ہے کہ اس کیس میں مجرم کی جانب سے حقائق کی روشنی میں صرف ریپ اور سیکشنل ایبوز کی نیت معلوم ہوتی ہے اور کہیں سے بھی یہ نہیں لگتا کہ مجرم نے ان گواہ کی نیت سے بچی کو بھگایا ہو اور اسی وجہ سے جسٹس صاحب نے دفعہ ۳۶۴ کے تحت سزائی جانے والی سزا کو اعدام قرار دے دیا۔ اس نکتے کے لئے جسٹس صاحب نے دو فیصلوں¹¹⁸ کا سہارا لیا ہے۔

اس انتہائی اہم فیصلہ کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ وفاقی اور صوبائی قوانین کے درمیان تنازع کی صورت میں ڈاکٹر اے آف کو پائینڈ فیئلڈ اور آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۴۳ کی روشنی میں وفاقی قانون کو فوقیت حاصل ہوگی اور کسی جرم کے ثابت کرنے کے لیے نیت کا ہونا بھی ضروری ہے اور فوجداری قوانین کو ریٹرو سپیکٹو حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔

¹¹⁴ “Sexual abuse” means employing, using, forcing, persuading, inducing, enticing, or coercing any child to engage in, or assisting any other person to engage in fondling, stroking, caressing, exhibitionism, voyeurism or any obscene or sexually explicit conduct or stimulation of such conduct either independently or in conjunction with other acts, with or without his consent.

¹¹⁵ 377A. Sexual abuse. Whoever employs, uses, forces, persuades, induces, entices, or coerces any person to engage in, or assist any other person to engage in fondling, stroking, caressing, exhibitionism, voyeurism or any obscene or sexually explicit conduct or stimulation of such conduct either independently or in conjunction with other acts, with or without consent where age of person is less than eighteen years, is said to commit the offence of sexual abuse.

¹¹⁶ 143. Inconsistency between Federal and Provincial law. If any provision of an Act of a Provincial Assembly is repugnant to any provision of an Act of Majlis-e-Shoora (Parliament) which Majlis-e-Shoora (Parliament) is competent to enact, then the Act of Majlis-e-Shoora (Parliament), whether passed before or after the Act of the Provincial Assembly, shall prevail and the Act of the Provincial Assembly shall, to the extent of the repugnancy, be void.

¹¹⁷ 2014 SCMR 535

¹¹⁸ 1985 SCMR 1822, 1986 SCMR 533.

دفعہ ۹۴ اور ۳۶۰-سی، مجموعہ ضابطہ فوجداری^{۱۸۹۸} اپنا ایک اہم فیصلہ^{۱۱۹} کامران علی چند¹²⁰

عدالت کے سامنے مندرجہ ذیل سوالات زیر غور تھے اور انہی سوالات کو عدالت عظمیٰ نے اپنے فیصلے میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

1. فوجداری کیس۔ مز میں کیا ملزم حق دفاع کا مرحلہ آنے سے قبل بھی دفعہ ۹۴ مجموعہ ضابطہ فوجداری، ۱۸۹۸ کے تحت عدالت کو درخواست دے سکتا ہے کہ استغاثہ کو ہدایت جاری کی جائے کہ وہ متعلقہ دستاویزات عدالت میں جمع کرائیں؟
2. دفعہ ۹۴ اور ۲۶۵-سی¹²¹ کا آپس میں کیا تعلق ہے اور ان کا دائرہ کار کیا ہے؟

حقائق:

کیس کے حقائق کچھ یوں ہیں کہ مدعا علیہ اور شریک ملزمان کو ڈرگ ریگولیٹری قانون کے تحت مقدمات کا سامنا تھا۔ ٹرائل کورٹ نے استغاثہ کی دستاویزات فراہم کیں، لیکن الزامات عائد کیے جانے سے پہلے، مدعا علیہ نے دفعہ ۹۴ کے تحت ۲۳ دستاویزات طلب کیں، یہ کہتے ہوئے کہ وہ استغاثہ کی قانونی حیثیت کا جائزہ لینے کے لیے اہم ہیں۔ ٹرائل کورٹ نے اس کو مسترد کر دیا اور عدالت عالیہ نے جرح کی ضرورت کا حوالہ دیتے ہوئے اجازت دے دی۔ استغاثہ نے یہ درخواست عدالت عالیہ کے فیصلے کے خلاف دائر کی تھی۔ اہم قانونی سوالات جو ہمارے زیر غور ہیں وہ یہ ہیں:

1. کیا ٹرائل شروع ہونے سے پہلے، کوئی ملزم درخواست دے سکتا ہے۔ ٹرائل کورٹ دفعہ ۹۴ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت اپنی طاقت کا استعمال کرے اور اسے ہدایت کرے۔ استغاثہ یا شکایت کنندہ کسی بھی دستاویز کو پیش کرنے کے لیے، جو کہ اس کے قبضے یا طاقت میں ہیں، جو دفعہ ۲۶۵-سی مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت نہیں آتا ہے۔
2. کیا ملزم اپنے دفاع میں داخل ہونے سے پہلے ایک بیان دے سکتا ہے۔ اس کے باوجود دفعہ ۹۴ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت کسی بھی دستاویز کی تیاری کے لیے درخواست دفعہ ۲۶۵-سی مجموعہ ضابطہ فوجداری کی دفعات، جو اسی طرح کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اسے دفاعی ثبوت کے مرحلے پر۔

دلائل:

مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۹۴ کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ انکوائری یا ٹرائل کے مرحلے کے حوالے سے کوئی خاص حد نہیں ہے جس پر عدالت دستاویزات کی تیاری کا حکم دینے کے لیے اپنے اختیار کا استعمال کر سکتی ہے۔ دفعہ ۹۴ کو استعمال کرنے کا واحد معیار جاری انکوائری یا ٹرائل کے لیے دستاویز کی ضرورت یا مطلوبہ ہے۔ دفعہ ۹۴ میں "جب بھی" کی اصطلاح کا مطلب ہے کہ عدالت انکوائری یا ٹرائل کے عمل کے دوران کسی بھی وقت اس طاقت کو استعمال کر سکتی ہے۔ مزید برآں، دفعہ ۱۹۴ اس بات پر پابندیاں عائد نہیں کرتا ہے کہ کس کے نقطہ نظر، خواہ وہ استغاثہ کا ہو یا ملزم کا، دستاویز کو مقدمے کے لیے ضروری یا فائدہ مند سمجھتا ہے۔ عدالت ایک غیر جانبدار ادارے کے طور پر کام کرتی ہے، جس معاملے کی جانچ کی جارہی ہے اس میں سچائی کا پتہ لگا کر انصاف کی فراہمی کا کام کرتی ہے۔ اس طرح، اگر کوئی دستاویز اس مقصد کو حاصل کرنے میں عدالت کی مدد کرتی ہے، تو اس کی تیاری کو ضروری یا مطلوبہ سمجھا جاتا ہے، اس سے قطع نظر کہ یہ استغاثہ کے مقدمے یا ملزم کے دفاع کی حمایت کرتا ہے۔ نتیجتاً، انکوائری یا مقدمے میں شامل کوئی بھی فریق دفعہ ۹۴ کے تحت دستاویز کی تیاری کی درخواست کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ عدالت کو مطمئن کریں کہ مقدمے کے مقاصد کے لیے دستاویز کی موجودگی ضروری ہے۔ ایسے حالات میں جہاں استغاثہ بے ایمانی، غفلت یا دیگر وجوہات کی بناء پر تفتیش یا مقدمے کی سماعت کے دوران کچھ دستاویزات فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے، یہ دستاویزات ملزم کی بے گناہی یا الزامات کے بے بنیاد ہونے کو ثابت کرنے میں اہم ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ ایسی دستاویزات مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۲۶۵-سی کے تحت نہیں آتی ہیں، جو دستاویزات کی فراہمی سے متعلق ہے، لیکن ان کی تیاری کے لیے ملزم کی درخواست سے انکار کرنا ناانصافی ہے۔

¹¹⁹ This judgement has been authored by Justice Syed Masoor Ali Shah. Criminal petition no: 112 of 2020.

¹²⁰ Law graduate from Shaheed Zulfiqar Ali Bhutto, University of Law, Karachi.

¹²¹ Section 94, THE CODE OF CRIMINAL PROCEDURE, 1898

¹²² Section 265-C, THE CODE OF CRIMINAL PROCEDURE, 1898

یہ خاص طور پر درست ہے اگر ان دستاویزات کو روکنے سے ملزم کو طویل ٹرائل کی کارروائی کا سامنا کرنا پڑے گا اور دفاعی مرحلے کا انتظار کیا جائے گا۔ مزید برآں، جب استغاثہ پولیس رپورٹ کے ساتھ متعلقہ دستاویزات پیش کرنے میں کوتاہی کرتا ہے، جو زیر تفتیش یا مقدمے کے لیے ضروری ہیں، تو ملزم استغاثہ کے گواہوں کی جرح کے دوران اپنے دفاع کے لیے انہیں استعمال کرنے کا پابند ہے۔ دفعہ ۹۴ کے تحت ملزم کی درخواست کو یہ دستاویزات پیش کرنے کی اجازت دینا دفاعی مرحلے کے دوران استغاثہ کے گواہوں کو واپس بلانے سے منسلک غیر ضروری تاخیر، اخراجات اور تکلیفوں کو روک کر انصاف کے مفادات کو پورا کرے گا۔ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۲۶۵-ایف [۷] 123 کے بارے میں، جو ملزم کو دفاعی مرحلے میں داخل ہونے کے بعد دستاویز کی تیاری کی درخواست کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

یہ اسی مجموعہ کے دفعہ ۹۴ [۱] کے تحت ٹرائل کورٹ کی طاقت کو کم نہیں کرتا ہے۔ دفعہ ۲۶۵-ایف [۷]، دفعہ ۹۴ [۱] کو اوور رائیڈ¹²⁴ یا محدود نہیں کرتا؛ بلکہ، یہ دونوں حصے مختلف مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں اور الگ الگ دائرہ کار رکھتے ہیں۔ دفعہ ۹۴ [۱] انکوآری یا ٹرائل میں دونوں فریقوں کو کسی بھی مرحلے پر دستاویز کی تیاری حاصل کرنے کا حق دیتا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ درخواست کردہ دستاویز مقدمے کے مقاصد کے لیے ضروری یا مطلوب ہو۔ دوسری طرف، دفعہ ۲۶۵-ایف [۷] ملزم کو دفاعی مرحلے کے دوران ایک ہی طرح کا موقع فراہم کرتا ہے، ایک تنگ حالت کے ساتھ۔ درخواست پریشان کن نہیں ہونی چاہیے، جس کا مقصد تاخیر یا انصاف کو نقصان پہنچانا ہے۔ آخر میں، تجربہ دو اہم نکات کی تصدیق کرتا ہے: پہلا، ایک ملزم مقدمے کے آغاز سے پہلے ہی مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۹۴ کا استعمال کر کے دستاویز کی تیاری کی درخواست کر سکتا ہے، بشرطیکہ دستاویز مقدمے کے مقاصد کے لیے ضروری یا مطلوب ہو۔ دوسرا، ایک ملزم دفعہ -ایف [۷] کی دفعات کے باوجود دفعہ ۹۴ کے تحت دستاویز کی تیاری کے لیے درخواست دے سکتا ہے، جو دفاعی مرحلے کے دوران ایسا ہی موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ دونوں سوالوں پر عدالت کے موقف کو واضح کرتا ہے اور منصفانہ اور مکمل انکوآری یا مقدمے کی کارروائی کے لیے دستاویز کی تیاری کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

آخری فیصلہ:

ٹرائل کورٹ کے حکم اور عدالت عالیہ کے فیصلے کا جائزہ لینے پر، یہ واضح ہوتا ہے کہ ٹرائل کورٹ نے دفعہ ۹۴، کی مناسب گرفت کے بغیر مدعا عالیہ کی درخواست کو مسترد کرنے میں غلطی کی، جبکہ عدالت عالیہ نے دفعہ کو سمجھا لیکن اس کی درخواست میں غلطی کی۔ عدالت عالیہ کو یہ تجزیہ کرنا چاہیے تھا کہ مذکورہ قانون کے تحت ۲۳ دستاویزات میں سے ہر ایک کس طرح ضروری تھا۔ عدالت عالیہ کے فیصلے میں قانونی حملیت کا فقدان ہے، اور اسے ٹرائل کورٹ کو درخواست کا دوبارہ جائزہ لینے کی ہدایت کرنی چاہیے تھی۔ اس طرح، درخواست کو جزوی طور پر اجازت دی جاتی ہے، عدالت عالیہ کی جانب سے ٹرائل کورٹ کے حکم کو کالعدم قرار دیتے ہوئے، لیکن مدعا عالیہ کی درخواست کی منظوری کو مسترد کرتے ہوئے۔ ٹرائل کورٹ کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مدعا عالیہ کی درخواست کا از سر نو جائزہ لے۔

ایف آئی آر کے اندراج کے بعد کیا اس ایف آئی آر کو ختم کیا جاسکتا ہے کے حوالے سے عدالت

عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ

احتشام الحق^{۱۲۵}

حقوق:

¹²³ **Section 265F(7):** If the accused, or any one of several accused, after entering on his defense, applies to the Court to issue any process for compelling the attendance of any witness for examination or the production of any document or other thing, the Court shall issue such process unless it considers that the application is made for the purpose of vexation or delay or defeating the ends of Justice. Such ground shall be recorded by the Court in writing.

¹²⁴ override

¹²⁵ طالب علم، شریعہ و قانون اسلامیہ کالج پشاور

روزنامہ اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی، کہ ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۳ء تک کیسیٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں بہت سے ڈائریکٹرز کو غیر قانونی طریقے سے ترقیاں دی گئی ہیں اس خبر کو مصدقہ مانتے ہوئے ایف۔آئی۔اے نے انکو آئری شروع کی اور وہ تمام لوگ جو اسمیں ملوث تھے یعنی بنیفشٹ مری اور وہ افسران جنہوں نے اس پر اسیس کی تصدیق کی، کے خلاف پولیس سٹیشن ایف۔آئی۔اے، اسلام آباد میں، ایف۔آئی۔آر نمبر ۲۰۱۸/۵، زیر دفعات ۱۰۹/۲۰۰۹ مجموعہ تعزیرات پاکستان اور دفعہ ۵ [۲] پر یونٹن آف کرپشن ایکٹ¹²⁶ کے تحت ایف۔آئی۔آر درج کروادی۔

سید حامد علی شاہ اور دوسرے ملزمان نے عدالت عالیہ میں آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت رٹ درخواست، اور زیر دفعہ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۵۶۱-اے کے تحت اس بنیاد پر دو درخواستیں دائر کی کہ ایف۔آئی۔آر میں موجودہ الزامات سے کوئی مجرم نہیں بنتا لہذا عدالت ایف۔آئی۔آر کو کالعدم (کواش) قرار دیا جائے۔ عدالت عالیہ نے رٹس اور درخواستوں کو ان بنیادوں پر قبول کرتے ہوئے اسی ایف۔آئی۔آر کو ختم کر دیا جس کے خلاف مدعی (ایف۔آئی۔اے بذریعہ ڈائریکٹر جنرل ایف۔آئی۔اے) نے عدالت عظمیٰ میں اپیل دائر کی۔ کیس سننے کے بعد عدالت نے اپنے فیصلے میں یہ قرار دیا کہ عدالت عالیہ کے پاس ایف۔آئی۔آر ختم کرنے کا اختیار نہیں۔

لہذا جو درخواستیں زیر دفعہ ۵۶۱ [اے] کے تحت دی گئی ہے وہ برقرار رکھنے کے قابل نہیں۔ مندرجہ بالا دفعہ میں عدالت عالیہ کے پاس اختیار صرف "جوڈیشل یا کورٹ پروسیڈنگ" میں ہے۔ عدالت عدالت عظمیٰ کے ایک اور کیس (شہناز بیگم) کا حوالہ کا دیتے ہوئے کہ دفعہ ۵۶۱ [اے] میں عدالت عالیہ کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے کسی جوڈیشل یا کورٹ پروسیڈنگ کو ختم کر سکتے ہیں یعنی ضروری ہے کہ وہ جوڈیشل پروسیڈنگ ہونا کسی ڈیپارٹمنٹ یا اتھارٹی کی۔

مزید یہ کہ ٹرائل کے دوران ملزم کے پاس بریت کے لیے ۲۳۹ [اے] اور ۲۶۵ [اے] کی تلافی موجود ہے اور اگر چالان سے پہلے ملزم کے خیال میں تفتیش غیر قانونی ہے تو اس کے لیے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت جوڈیشل ریویو کر سکتا ہے۔ کیس سننے کے بعد عدالت نے اپنے فیصلے میں یہ قرار دیا کہ عدالت عالیہ کے پاس ایف۔آئی۔آر کو کواش کرنے کا اختیار نہیں۔ ایف۔آئی۔اے ایک وفاقی تفتیشی ادارہ ہے جس کا مقصد کچھ جرائم کی تفتیش اور انکو آئری کرنا ہے اس لیے تفتیشی افسر کے پاس وہ تمام اختیارات ہوتے ہیں جو کہ پولیس کے پاس تفتیش کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اب اس کیس میں یہ سوال کہ کیا ایف۔آئی۔اے کا ملزمان کے خلاف ایف۔آئی۔آر درج کرنا اور خود تفتیش کرنا قانونی ہے کہ نہیں؟

اس سوال کے تفصیل میں جاتے ہوئے عدالت نے کہا کہ قابل دست اندازی جرائم¹²⁷ کی رپورٹ اور تفتیش پولیس افسر ضابطہ فوجداری زیر دفعات بالترتیب ۱۵۳ اور ۱۵۶ کے تحت کرتا ہے، اب ایک جرم کا قابل دست انداز یا ناقابل دست انداز ہونا اس الزامات سے معلوم ہوتی ہے جو رپورٹ میں درج ہوتی ہے اس لیے عدالت کے سامنے یہ سوال تھا کہ کیا اس کیس میں رپورٹ میں جو الزامات ہیں اس سے قابل دست انداز جرم بنتا ہے کہ نہیں؟

جس کے جواب کے لیے عدالت یہ سوالات کہ کیسے یہ "اپگریڈیشن" (کریمنل بریج آف ٹرسٹ) [زیر دفعہ ۴۰۹ مجموعہ تعزیرات پاکستان، اور] (کریمنل مس کنڈکٹ) [زیر دفعہ ۵ [۲] پر یونٹن آف کرپشن ایکٹ میں آتا ہے اور اسی طرح یہ سوال کہ کیسے وہ ملزمان جو اس اپگریڈیشن میں ملوث ہیں اعانت¹²⁸ زیر دفعہ ۱۰۹ مجموعہ تعزیرات پاکستان، کے مرتکب ہیں؟۔ مدعی کے وکیل کے جوابات عدالت عظمیٰ کو معقول نہیں لگے اور اس بناء پر کہ ایف۔آئی۔آر میں جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔

لہذا اپگریڈیشن پر قابل دست انداز جرائم زیر دفعہ ۴۰۹ مجموعہ تعزیرات پاکستان اور ۵ [۲] پر یونٹن آف کرپشن ایکٹ لاگو نہیں ہوتے اس کو متعلقہ رولز کے مطابق "مس کنڈکٹ" میں آسکتا ہے جو کہ ضابطہ فوجداری میں قابل دست انداز جرم ہے لہذا عدالت درخواست خارج کرنے کیساتھ ساتھ ایک لاکھ روپے جرمانہ بھی عائد کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ عدالت عالیہ کے پاس ایف۔آئی۔آر کو کواش کرنے کا اختیار نہیں اور اس کے لیے متبادل راستہ یہ ہونا چاہیے کہ اگر ملزمان ٹرائل کے دوران (یعنی تفتیش اور چالان جمع ہونے کے بعد) الزامات کی تردید کرتا ہے تو اس کے پاس ۲۶۵ [اے] اور ۲۳۹ [اے] کی اپیل کے تحت درخواست کاراستہ موجود ہے جس میں وہ بریت کے لیے درخواست دے سکتا ہے لیکن اگر ملزم چالان جمع ہونے سے قبل تفتیش کو چیلنج کرتا ہے تو وہ آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت اس کو چیلنج کر سکتا ہے۔

¹²⁶ The Prevention of Corruption Act, 1947

¹²⁷ Non-cognizable offence.

¹²⁸ Abetment.

عدالت عظمیٰ کا نمائندہ نمونہ¹³² کے حوالے سے اہم فیصلہ¹³³ محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ¹³⁴

حقائق:

ملزم کو کنٹرول فار نارکوٹکس سبسٹانس ایکٹ¹³² کے زیر دفعہ ۹-سی کے تحت چارج کر کے ۱ جنوری ۲۰۱۳ کو مانسہرہ پولیس نے گرفتار کیا۔ یاد رہے کہ ملزم پر الزام یہ تھا کہ ملزم کے قبضے سے ۲۵ کلوچرس برآمد ہوئی ہے جو کہ ایک بڑی بوری کے اندر پچیس پیکیٹس اور ہر ایک پیکیٹ میں چرس کے چودہ سلیب تھے۔ ضمانت کی درخواستیں خارج ہونے کے بعد ریگولر ٹرائل کا آغاز ہوا اور ریگولر ٹرائل میں ملزم کو عمر قید اور دو لاکھ روپے جرمانہ کیا گیا۔ ملزم کی طرف سے عدالت عالیہ میں اپیل پر عدالت عالیہ نے بھی ٹرائل کورٹ کی سزا کو برقرار رکھا جس کے بعد ملزم کی جانب سے عدالت عظمیٰ میں [سول پیٹیشن فار ریویو ٹو اپیل]¹³³ دائر کی گئی اور یہ درخواست صرف اس بنیاد پر منظور ہوئی کہ کیا موجودہ کیس میں ٹرائل کورٹ اور عدالت عالیہ کی جانب سے ان اصولوں کا خیال رکھا گیا ہے یا نہیں جو اصول عدالت عظمیٰ نے امیر زیب بنام سرکار¹³⁴ اور سرکار بنام امام بخش¹³⁵ میں وضع کیے تھے۔ پیٹیشن منظور ہونے کے بعد یہ کیس عدالت عظمیٰ کے تین رکنی بینچ جن میں جسٹس منصور علی شاہ، جسٹس طارق مسعود اور جسٹس قاضی امین کے سامنے لگایا گیا۔ یہ اہم ججمنٹ جسٹس منصور علی شاہ صاحب نے لکھی ہے اور جسٹس طارق مسعود نے اتفاق جب کہ جسٹس قاضی امین نے اختلافی نوٹ لکھا ہے۔

اس کیس میں عدالت عظمیٰ کے سامنے ایک ہی سوال تھا اور وہ یہ تھا کہ ملزم کے قبضے سے جو ۲۵ کلوچرس برآمد ہوئی تھی جو کہ پچیس پیکیٹس اور ہر ایک پیکیٹ میں چودہ سلیب کے اندر چھپائی گئی تھی تو کیا لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے ۲۵ پیکیٹس سے صرف پچیس نمونے کافی ہیں یا ۲۵ پیکیٹس کے اندر ۱۴ سلیبز میں ہر ایک سلیب سے الگ الگ یعنی ٹوٹل ۳۳۵۰ سیپل لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے بھیجے ہوں گے؟

مندرجہ بالا سوال پر دونوں فریقین یعنی سرکار اور ملزم کی طرف سے بحث عدالت عظمیٰ نے مندرجہ ذیل اصول طے کئے ہیں۔

نوٹ: عدالت عظمیٰ کے اس فیصلے کی سب سے خوبصورت بات جو اس فیصلے کو باقی فیصلوں سے ممتاز بناتی ہے وہ یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ نے اس فیصلے میں صراحتاً لکھا ہے کہ امیر زیب بنام سرکار میں عدالت عظمیٰ نے جو فیصلہ دیا تھا تو وہ ہم پر بائینڈنگ ہے کیونکہ وہ بینچ پانچ ججز پر مشتمل تھا اور ہمارا بینچ تین ججز پر مشتمل ہے۔ عدالت عظمیٰ نے اپنے فیصلے کا آغاز اس بات سے کیا ہے کہ کنٹرول فار نارکوٹکس سبسٹانس ایکٹ کے دفعہ ۳۶ کے تحت لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے گورنمنٹ تجزیہ گار کے پاس نارکوٹکس کا نمونہ بھیجا جاتا ہے جب کنٹرول فار نارکوٹکس سبسٹانس رولز¹³⁶ کے رول ۴ کے تحت یہ بات لازمی ہے کہ لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے بھیجا جانے والا نمونہ مناسب مقدار میں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد امیر زیب بنام سرکار کیس میں طے ہونے والا یہ اصول بتایا ہے کہ "نمائندہ نمونہ مشکوک مواد کے ہر ایک پیکیٹ، سلیب سے الگ الگ لیا جائے گا"۔ اس کے بعد عدالت عظمیٰ نے امیر زیب بنام سرکار کیس کے فیصلے کا متعلقہ حصہ نقل کیا ہے جس کے مطابق لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے لیا جانے والا نمونہ لازمی پورے مشکوک سبسٹانس کا نمائندہ ہونا چاہیے اور اگر کسی بھی الگ پیکیٹ یا سلیب سے نمونہ لیا جائے اور یا ان نمونوں کو الگ نہ رکھا گیا ہو تو پھر یہ نمونہ نمائندہ نمونہ نہ ہوگا اور یہ اس لئے نمائندہ نمونہ نہیں ہوگا تاکہ ہر حال میں انصاف کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور ہر حال میں شہریوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

اس کے بعد عدالت عظمیٰ نے قرار دیا کہ چونکہ موجودہ کیس میں ہر ایک پیکیٹ میں ۱۴ سلیب موجود تھے جن میں ہر ایک پیکیٹ میں سے صرف ایک ایک سلیب سے نمونہ لیا گیا ہے تو یہ نمونہ نمائندہ نمونہ نہ ہے کیونکہ اس کیس میں پچیس نمونے نہیں بلکہ نمائندہ نمونے کے لئے ۳۵۰ نمونے ہونے چاہیے لیکن چونکہ ۳۵۰ کی بجائے صرف ۲۵ نمونے لئے گئے

¹²⁹ Representative Sample.

¹³⁰ This important judgement can be searched and cited as PLD 2022 SC 281.

¹³¹ پشاور بار ایلیسو ایٹن۔

¹³² KP-Control of Narcotic Substances Act, 2019

¹³³ Civil Petition for Leave to Appeal (CPLA)

¹³⁴ PLD 2102 SC 380

¹³⁵ 201 SCMR 2039

¹³⁶ Control of Narcotics Substances (Govt Analysts) Rules 2001

تھے تو اسی تناسب نے عدالت عظمیٰ نے ایک سلیب میں موجود مقدار جو کہ اکثر گرام بنتی ہے تو اے کو ۲۵ سے ضرب دے کر جس سے ٹوٹل مقدار ۱۷۸۵ گرام بنتی ہے تو اس سبب کے بعد عدالت عظمیٰ نے ۲۵ کلو کی سزا یعنی عمر قید کو کم کر کے صرف ۱۷۸۵ گرام کی سزا کو برقرار رکھا اور ساتھ میں جرمانے کو بھی برقرار رکھا۔ اس کیس کا خلاصہ یہ ہے کہ نمائندہ نمونہ وہ نمونہ شمار ہوگا جب مشکوک مواد کے ہر ایک پیکٹ اور سلیب سے الگ الگ نمونہ لیا جائے اور الگ الگ رکھ کر لیبارٹری بھیجا جائے بصورت دیگر نمونہ نمائندہ شمار نہ ہوگا اور اسی حساب سے سزا کو کم کیا جائے گا۔

فقہ جعفریہ میں بے اولاد بیوی کی میراث کے حوالے سے لاہور عدالت عالیہ کا فیصلہ^{۱۳۸}

مدثر اقبال¹³⁹

عدالت کے سامنے سوال یہ تھا کہ کیا بے اولاد بیوہ کو اپنے خاوند (شیعہ) کے ترکہ سے حصہ ملے گا؟

حقائق:

خالدہ شمیم اختر (مدعی) کو غلام جعفر اور نور خان (مدعی الیہ) نے اپنے شوہر کے ترکہ میں حصہ دینے سے انکار کیا۔ جس کی وجہ اس نے ٹرائل کورٹ میں درخواست دائر کی اور فیصلہ اس کے حق میں ہوا۔ اس کے بعد غلام جعفر اور نور خان نے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج چکوال کی عدالت میں اپیل دائر کی اور اپیل میں خالداہ کو شوہر کے میراث سے محروم کر دیا گیا جس پر اس نے لاہور عدالت عالیہ (راولپنڈی برانچ) میں سول نظر ثانی کی درخواست¹⁴⁰ جمع کی۔

غلام جعفر اور نور خان کے وکیل نے درخواست کے خلاف اپنے بیان میں کتاب "بیوی کی میراث مصنف علامہ مفتی طیب اناموسائی" اور عدالت عظمیٰ کے فیصلہ¹⁴¹ بھی حوالہ دیا۔

جج عبدالرحمن لودھی نے کیس کے دونوں فریقین کو سنا۔ عدالت نے اس کیس میں اپنے راہنمائی کے لیے شیعہ علماء کی مدد حاصل کی، جس کے جواب میں علامہ سید افتخار حسین نقوی (ممبر اسلامی نظریاتی کونسل) نے عدالت کی راہنمائی کی اور اپنے کتاب "کتاب میراث" مجموعہ ۳ باب نمبر ۹ کا حوالہ دیا۔ اس کیس میں عدالت عالیہ نے عدالت عظمیٰ کے دو فیصلوں¹⁴² کا تفصیلی تجزیہ کیا۔ پہلے کیس میں عدالت عظمیٰ نے (شیعہ کمیونٹی میں یہ اصول تھا کہ بے اولاد بیوہ کو اپنے شوہر کے غیر منقولہ جائیداد سے حصہ نہیں ملے گا) نے یہ کہا ہم ایک ایسی اصول کو تبدیل نہیں کر سکتے جس کی حیثیت اجتماع کی ہو اور اس پر قانون سازی ہونی چاہیے۔ دوسرے کیس میں عدالت نے مسلمانوں کے فرقوں کے حوالے سے کہا کہ یہ ضروری نہیں کہ مسلمان یا تو شیعہ ہو یا سنی ہو۔

اس کے بعد عدالت نے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۲ کا حوالہ دیا اور ساتھ میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے¹⁴³ بھی رجوع کیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ کس بھی کتاب میں کوئی بھی بات قرآن اور سنت کے برعکس ہو وہ غلط ہوگی اور ساتھ میں کتاب [مختران لاء مصنف ڈی ایف ملا] پر تبصرہ کیا کی اس کتاب کے اصول قابل اطلاق نہیں ہے کیونکہ یہ ایک کوڈ شدہ¹⁴⁴ قانون نہیں ہے۔ "کتاب میراث" کا جائزہ بھی لیا گیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ فقہ جعفریہ میں بے اولاد بیوہ کو اپنے شوہر کے تمام ترکہ میں حصہ ملے گا اور یہ اصول سورۃ النساء میں بھی واضح ہے۔

آخر میں عدالت نے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج چکوال کے فیصلے کو ختم کر کے ٹرائل کورٹ کے فیصلے جو بحال کر کے کہا کہ بے اولاد بیوہ کو اپنے شوہر کے ترکہ میں چوتھائی حصہ ملے گا۔

¹³⁷ Issueless means Without issue (children).

¹³⁸ Case Citation: PLD 2016 Lahore 865

¹⁴⁰ Civil Revision Petition

¹⁴¹ PLD 1976 SC 346

¹⁴² PLD 1972 SC 346, 2010 SCMR 1915

¹⁴³ Shariat Petition No.06/I of 2013

¹⁴⁴ Codified law is statutes and regulations.

¹³⁹ طالب علم شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

لاہور عدالت عالیہ کی خلع و طلاق اور تنسیخ نکاح پر بہت ہی اہم فیصلہ^{۱۴۵}

سجاد حمید یوسفزئی

حقائق:

حقائق کچھ یوں ہیں کہ خاتون نے فیملی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا جس میں یہ موقف اپنایا گیا کہ شوہر کا تعلق میرے ساتھ ٹھیک نہیں ہے اور وہ مار پیٹ کرتا ہے وغیرہ وغیرہ لہذا مجھے میرا حق مہر جو کہ تین ملین سے زیادہ ہے اور دیگر جہیز کا سامان یہ سارا واپس کیا جائے اور عدالت مجھے خاوند سے طلاق دلوائے بالفاظ دیگر عدالت نکاح کی تنسیخ کرے۔ فیملی کورٹ نے فیصلہ کرتے ہوئے تنسیخ نکاح کے بجائے خلع کا حکم پاس کیا اور خاتون کو حکم دیا کہ حق مہر سے دستبردار ہو جائیں۔ مذکورہ خاتون اپیل میں گئی اور اپیل میں بھی یہی فیصلہ برقرار رکھا گیا جس کے بعد خاتون کو مجبوراً عدالت عالیہ میں رٹ دائرہ اختیار^{۱۴۶} میں جانا پڑا۔

معزز عدالت نے طے کیا کہ خلع بیوی کا شرعی حق ہے یہ عدالت کا اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کو بھی بن مانگے اس کا حق دلوانا شروع کر دے اگر خاتون خلع نہیں مانگ رہی بلکہ تنسیخ نکاح کی بنیاد پر طلاق مانگ رہی ہے تو عدالت تنسیخ نکاح کے بجائے خلع دینے کا اختیار نہیں رکھتی۔ اس صورت میں عدالت کو شہادت میں جانا ہو گا اور پراپر ٹرائل کے ذریعے یہ طے کرنا ہو گا کہ آخر کن وجوہات کی بناء پر خاتون کو طلاق دی جاسکتی ہے یا نکاح کی تنسیخ کی جاسکتی ہے۔ سب سے اہم نکتہ جو معزز جج نے طے کیا وہ یہ ہے کہ معزز جج نے صراحتاً لکھا کہ خلع کی صورت میں بھی اگر خاتون خلع کے لیے راضی ہو مگر شوہر کی طرف سے اجازت نہ دی جائے تو یہ خلع شرعاً قانوناً جائز نہیں ہو گا کیونکہ شریعت کہتی ہے کہ خلع میں شوہر کی اجازت ضروری ہے۔ اگر خاتون خلع مانگ لے اور شوہر انکار کر دے تو شریعت و قانون میں خلع مؤثر تصور نہ ہو گا اس لیے خاوند کی اجازت یا قبول ضروری ہے (اس کے لیے دیکھیے مذکورہ رجسٹری کا پیرا نمبر ۱۳)۔

معزز جج نے مزید یہ کہا کہ خاتون جن وجوہات کی بناء پر خاوند سے اپنا نکاح منسوخ کرانا چاہتی ہے اگر وہ وجوہات ثابت نہ ہو جائے تو اس صورت میں بھی عدالت خود سے خلع کا حکم نہیں دے سکتی بلکہ عدالت کو دیگر وجوہات کی طرف جانا ہو گا اور عدالت کو دیگر وجوہات کی بناء پر فیصلہ کرنا ہو گا کہ نکاح کی تنسیخ کی جائے لیکن خلع کی بنیاد پر نہیں۔ (اس کے لیے دیکھیے پیرا نمبر ۱۲)۔ مزید اسی پیرا سے آگے پیرا نمبر ۱۵ میں طے پایا کہ خلع کی صورت میں عدالت ایک طرف فیصلہ نہیں دے سکتی یعنی خاوند کی غیر موجودگی میں خلع کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر شوہر ان شرائط پر خلع دینے پر راضی نہ ہو جن پر بیوی خلع لینا چاہ رہی ہو تو عدالت تب تک خلع کا حکم جاری نہیں کر سکتی جب تک دونوں کچھ شرائط پر متفق ہو کر خلع کا فیصلہ نہ کر دے۔ مزید یہ کہا گیا کہ اگر خاوند کی بیوی کے ساتھ ناہنجی ہو اور خاوند طلاق بھی نہ دینا چاہ رہا ہو بلکہ بیوی کو اس طرز پر ٹریٹ کر رہا ہو کہ بیوی مجبور ہو کر خلع مانگ لے اور خاوند کو حق مہر فوج جائے تو اس صورت میں عدالتوں کو بہت محتاط ہونا چاہیے اور معاملہ کی تک پہنچانا چاہیے کہ آخر غلطی کس کی ہے یا ظلم کون کر رہا ہے۔

مذکورہ رجسٹری میں قرآن پاک سے اور ہدایہ سے بھی حوالہ دیا گیا ہے۔

¹⁴⁵ Citation of the judgment is PLD 2021 Lahore 757.

¹⁴⁶ Writ Jurisdiction Under Article 199 Of the Constitution of The Islamic Republic of Pakistan, 1973.

پڑ پوتے^{۱۴۷} کے میراث کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ^{۱۴۸} ذوالقرنین ایڈووکیٹ^{۱۴۹}

حقوق:

تمیز النساء نام کی ایک عورت جو کہ اس کیس میں مورث اعلیٰ ہیں یعنی جس سے میراث کی تقسیم کا آغاز ہوتا ہے۔ تمیز النساء ۱۹ جون ۲۰۱۵ کو فوت ہو جاتی ہیں اور اپنے پیچھے ترکے میں اسلام آباد میں ایک رہائشی گھر چھوڑ دیتی ہیں۔ یاد رہے کہ تمیز النساء کے دو بیٹے ان سے پہلے ہی فوت ہوئے تھے جن میں ایک کا نام نواب الدین تھا اور یہ ۱۹۹۲ میں فوت ہوا تھا۔ نواب الدین کا بھی ایک بیٹا تھا جس کا نام عزیز الرحمن تھا جو کہ رشتے میں تمیز النساء کا پوتا لگتا تھا لیکن یہاں سے اصل مسئلہ یعنی اس کیس کا آغاز ہوتا ہے اور آغاز ایسے ہوتا ہے کہ تمیز النساء کا عزیز الرحمن نامی پوتا بھی تمیز النساء سے پہلے یعنی ۲۰۰۵ میں فوت ہو جاتا ہے اور تمیز النساء کی وفات ۲۰۱۵ میں ہوئی ہوتی ہے اور اس کیس کے مدعی بھی عزیز الرحمن کے بیٹے یعنی تمیز النساء کے پڑ پوتے ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ تمیز النساء کے پڑ پوتے مسلم فیملی لاز آرڈیننس کے دفعہ ۴^{۱۵۰} کے تحت تمیز النساء کے ترکے میں اپنے حصے کے لئے اسلام آباد کے سول جج کے پاس کیس کر لیتے ہیں جو کہ خارج ہو جاتی ہے۔ وہاں سے مدعیان ہائی کورٹ میں کیس کرتے ہیں اور ہائی کورٹ بھی ان کا کیس خارج کر دیتی ہے۔ سول جج اور ہائی کورٹ سے کیس خارج ہونے کے بعد مدعیان عدالت عظمیٰ میں سی پی ایل اے فائل کرتے ہیں اور یہاں سے عدالت عظمیٰ میں اس کیس کا آغاز ہوتا ہے۔ عدالت عظمیٰ میں یہ کیس تین رکنی بینچ جو کہ چیف جسٹس عمر عطاء بندیال، جسٹس منیب اختر اور جسٹس قاضی محمد امین احمد پر مشتمل ہوتی ہے۔

عدالت عظمیٰ کے سامنے ایک ہی سوال رکھا گیا تھا جو کہ یہ ہے کہ کیا پڑ پوتے مسلم فیملی لاز آرڈیننس کے دفعہ ۴ میں مستعمل لفظ "چلڈرن" میں شمار ہوں گے یا نہیں؟ عدالت عظمیٰ نے اس سوال کا جواب یہ کیس خارج کر کے یہ دیا ہے کہ پڑ پوتے "چلڈرن" میں شمار نہیں ہوتے اور یوں تمیز النساء کے پڑ پوتے یعنی عزیز الرحمن کے بیٹے تمیز النساء کے ترکے میں کوئی حصہ نہیں رکھتے۔ عدالت عظمیٰ نے اپنے اس جواب کا آغاز دفعہ ۴ ہی سے کیا ہے اور دفعہ ۴ کے الفاظ نقل کرنے کے بعد عدالت عالیہ کے فیصلے کا ایک پیرا گراف نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سیکشن کو فیڈرل شریعت کورٹ نے خلاف اسلام قرار دیا ہے لیکن چونکہ اس فیصلے کے خلاف اپیل ہوئی ہے جو کہ پینڈنگ ہے لہذا فیڈرل شریعت کورٹ کا فیصلہ معطل ہے اور یوں دفعہ ۴ مسلم فیملی لاز آرڈیننس کا حصہ ہے

عدالت عظمیٰ میں مدعیان کے وکیل کا سارا دار و مدار دفعہ ۴ میں مستعمل اصطلاح "پرسٹرائپس" رہی اور ان کا سارا زور اس بات پر رہا کہ پوتوں کے پہلے فوت ہونے کی صورت میں پڑ پوتے، پوتوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ عدالت عظمیٰ نے اپنے فیصلے میں "پرسٹرائپس" کی اصطلاح کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ اصطلاح مشہور کیس لا^{۱۵۲} میں پہلے ہی اس پر تفصیلی بحث کے بعد فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور اس کے بعد صراحتاً یہ لکھا ہے کہ دفعہ ۴ صرف ان پوتوں کے لیے ہے جو مورث اعلیٰ کی وفات کے وقت زندہ ہوں اور اس کے بعد جسٹس صاحب نے فیصلے میں لکھا ہے کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی قوانین میں اس پوتے کا اپنے نانا یا دادا کے میراث میں کوئی حصہ نہیں ہوتا جس کا باپ اس کے نانا یا دادا سے پہلے فوت ہو جائے لیکن ساتھ میں یہ بھی لکھا ہے کہ دفعہ ۴ اس مندرجہ بالا رول میں ایک استثناء ہے اور اس کے بعد مزید لکھا ہے کہ دفعہ ۴ میں "چلڈرن" لفظ استعمال ہوا ہے نہ کہ "قانونی وارث" اور یہ بات بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ موجودہ مدعیان کا کیس دفعہ ۴ کے تحت نہیں آتا۔ فیصلے کے آخر میں عدالت عظمیٰ نے سول جج اور ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے یہ فیصلہ دیا کہ پڑ پوتے دفعہ ۴ کے تحت میراث کے حق دار نہیں ہیں یعنی کہ عزیز الرحمن کے بیٹوں کا تمیز النساء کی جائیداد میں کوئی حصہ نہیں بنتا۔

نوٹ: مندرجہ بالا کیس میں اسلام آباد عدالت عالیہ کا فیصلہ بھی رپورٹ ہوا تھا جس کا حوالہ [۲۰۲۱ سی-۱۸۲۱] ۱۵۳ ہے۔

¹⁴⁷ Great Grand Children.

¹⁴⁸ Note: This Important Judgement of Supreme Court Can Be Searched and Cited As " 2022 SCMR 1131 " .

¹⁴⁹ پشاور ہار ایسوسی ایشن۔

¹⁵⁰ **Section 4. Succession.** In the event of death of any son or daughter of the propositus before the opening of succession, the children of such son or daughter, if any, living at the time the succession opens, shall per stripes, receive a share equivalent to the share which such son or daughter would have received if alive.

¹⁵¹ Per stirpes is a legal term from Latin, used in the law of inheritance and estates. An estate of a decedent is distributed per stirpes if each branch of the family is to receive an equal share of an estate.

¹⁵² PLD 1990 SC 1051.

¹⁵³ 2021 CLC 1821

نکاح کے لئے کم عمر کی شرط اور کم عمری کی شادی کے کیس میں ضمانت کے حوالے سے اسلام آباد عدالت عالیہ کا ایک اہم فیصلہ¹⁵⁴

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ¹⁵⁵

حقوق:

لائبہ نور نامی ایک لڑکی کے والد کی شکایت پر تھانہ سہالہ میں اس کیس کے مدعی عبدالرزاق کے خلاف مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۳۶۵ [بی] 156 کے تحت جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے مسما لائبہ کو اغوا کرنے کی ایف آئی آر درج ہوئی جس کے بعد مدعی کو پولیس کی جانب سے گرفتار کیا گیا اور گرفتاری کے بعد اسلام آباد کے ایڈیشنل سیشن جج صاحب نے مدعی کی ضمانت کی درخواست بھی خارج کر دی جس کے بعد مدعی کی جانب سے اسلام آباد عدالت عالیہ میں ضمانت کی درخواست دائر کی گئی۔

استغاثہ کی جانب سے مدعی پر یہ الزام تھا کہ مدعی نے مسما لائبہ نور کو جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے اغوا کیا تھا جبکہ دوسری جانب مدعی کی جانب سے یہ دلائل دئے گئے کہ استغاثہ کا الزام بے بنیاد ہے کیونکہ مدعی نے مسما لائبہ نور سے باقاعدہ نکاح کیا ہوا ہے اور اس بابت عدالت کے سامنے نکاح نامہ اور لڑکی کی جانب سے نکاح کے وقت دیا گیا ایک حلفی بیان بھی جمع کرایا گیا اور مدعی الیہ پر یہ الزام عائد کیا کہ لڑکی کا والد لڑکی کو جبراً اسماں کر کے لڑکی کو نکاح سے انکاری ہونے کا کہہ رہا ہے۔ جبکہ ریاست کے وکیل اور مدعی الیہ کے وکیل کی جانب سے یہ نکتہ اٹھایا گیا کہ لڑکی قانون کی رو سے کم عمر ہے اور اسی وجہ سے اس کی جانب سے کیا گیا نکاح صحیح نہیں ہے اور لڑکی کا عدالت میں دیا گیا وہ بیان بھی پیش کیا گیا جس میں لڑکی کا کہنا تھا کہ اس نے مدعی کے ساتھ نکاح مدعی کی جانب سے زور زبردستی اور جبر کے تحت کیا تھا۔ مدعی الیہ کی جانب سے لڑکی کے ماتر ہونے کے جواب میں مدعی کے وکیل کا کہنا تھا کہ ریکارڈ کے مطابق لڑکی کی عمر سولہ سال سے زیادہ اور وہ بالغہ بھی ہے تو اس وجہ سے اس کا نکاح صحیح ہے۔

استغاثہ، مدعی اور مدعی الیہ کے وکلاء کی جانب سے دلائل کے بعد عدالت نے لڑکی کے نکاح کے لئے کم سے کم عمر میں قانونی مویشگانوں کو دیکھتے ہوئے بیرسٹر ظفر اللہ خان کو عدالتی معاون مقرر کیا کہ وہ نکاح کے لئے لڑکی کے کم سے کم عمر کے حوالے سے عدالت کو آگاہ کرے۔

بیرسٹر ظفر اللہ خان صاحب کے جانب سے نکاح کے لئے لڑکی کی عمر کے قانون کے حوالے سے مندرجہ ذیل باتیں رکھیں گئیں کہ بالخصوص اسلام آباد میں نکاح کے لئے لڑکی کے عمر کا قانون واضح نہیں ہے بلکہ اس میں کئی شبہات ہیں۔ اس کے بعد بیرسٹر صاحب نے سورہ نساء کی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ نکاح کے لئے صرف "بلوغت" کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ "رشد" کا ہونا لازمی ہے۔ بیرسٹر صاحب نے اس کے بعد کہا کہ کئی ایک اسلامی ممالک نے نکاح کے لئے ایک خاص عمر مقرر کی ہے اور اس کے بعد کم عمری کی شادی کے نقصانات کے لئے میڈیکل ریسرچ کے حوالے بھی دیے اور آخر میں عدالت کے سامنے یہ بات رکھی کہ مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں نکاح کے لئے کم سے کم ۱۸ سال عمر ایک بہتر عمر ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کا کہنا تھا کہ "چائلڈ میریج ریٹرنٹ ایکٹ" میں نکاح کے لئے کم سے کم عمر ۱۶ سال ہے۔ اس کے بعد بیرسٹر صاحب نے ڈی ایف ملا کی ٹیڈ لاکا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں نکاح کی عمر ۱۵ سال ہے۔ بیرسٹر صاحب کا مزید کہنا تھا کہ چونکہ دونوں فریقین فقہ حنفی سے تعلق رکھتے ہیں تو امام ابو حنیفہ رح کی رائے میں نکاح کی عمر ۱۵ سال ہے۔ اس کے بعد بیرسٹر صاحب نے عدالت عظمیٰ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ عدالت عظمیٰ کی رائے میں لڑکی کے لئے بغیر ولی کے نکاح کی

¹⁵⁴ This Important Judgement Is Written by Justice Amir Farooq of Islamabad High Court and It Can Be Searched and Cited As 2022 Pcr.LJ 953.

¹⁵⁵ پشاور بار ایسوسی ایشن۔

¹⁵⁶ **Section 365B. Kidnapping, abducting or inducing woman to compel for marriage etc.** Whoever kidnaps or abducts any woman with intent that she may be compelled, or knowing it to be likely that she will be compelled, to marry any person against her will, or in order that she may be forced, or seduced to illicit intercourse, knowing it to be likely that she will be forced or seduced to illicit intercourse, shall be punished with imprisonment for life, and shall also be liable to fine; and whoever by means of criminal intimidation as defined in this Code or of abuse of authority or any other method of compulsion, induces any woman to go from any place with intent that she may be, or knowing that it is likely that she will be, forced or seduced to illicit intercourse with another person shall also be punished as aforesaid.

صورت میں لڑکی کا "سوئی جیورس" ¹⁵⁷ ہونا لازمی ہے۔ مندرجہ بالا تمام دلائل دینے کے بعد بیرسٹر صاحب نے عدالت کے سامنے یہ بات رکھی کہ قانون میں لڑکی کے نکاح کے لئے کم سے کم عمر واضح نہیں ہے۔

استغاثہ، مدعی، مدعی الیہ اور عدالتی معاون کی طرف سے دلائل مکمل ہونے کے بعد عدالت نے فیصلے کا آغاز سورہ نساء کی آیت کے ترجمے اور مولانا مودودی کی تفسیر القرآن سے کیا ہے کہ نکاح کے لئے صرف بلوغت نہیں بلکہ "رشد" کا ہونا بھی لازمی ہے۔ رشد کی تعریف کے لئے عدالت نے "ہیننس ویبہر" ¹⁵⁸ کی ڈکشنری کا حوالہ دیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ بلوغت کے ساتھ فیصلہ سازی اور ذہنی پختگی نکاح کے لئے شرائط ہیں اور اس کے لئے جسٹس صاحب نے ایک کتاب "تحقیق عمر حضرت عائشہ صدیقہ رض" سے بھی حوالہ دیا ہے جس کے مطابق لڑکے کے نکاح کے ۱۸ سال اور لڑکی کے ۱۷ سال کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے بعد جسٹس صاحب نے چائلڈ میرج ریسٹریٹ ایکٹ ¹⁵⁹، ڈی ایف ملا کے حوالے بھی دیئے اور سندھ حکومت کی جانب سے لڑکی اور لڑکے دونوں کے نکاح کے لئے ۱۸ سال کا ہونا بھی ذکر کیا۔

مختلف قوانین اور مذاہب میں لڑکی کے نکاح کے لئے مختلف عمر کے ذکر کے بعد جسٹس صاحب نے فیڈرل شریعت کورٹ کے ایک فیصلے کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اگر کوئی مباح کام جس کے کرنے سے معاشرے کو نقصان ہو تو ریاست اس کام کو بند کروا سکتی ہے۔ اس کے بعد جسٹس صاحب نے اسلامی قانون کے ایک اہم اصول "سد الزرائع" کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ ریاست کسی بھی ایسے کام کو بند کروا سکتی ہے جس سے معاشرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور اس بابت جسٹس صاحب نے حضرت عمر فاروق رض کے دور کے ایک مشہور واقعے کا حوالہ بھی دیا ہے۔

مندرجہ بالا تمام امور کا جائزہ لینے کے بعد جسٹس صاحب نے لڑکی کے نکاح کے لئے اسلام آباد کی حد تک یہ صورت حال ہے کہ:

- i. چائلڈ میرج ریسٹریٹ ایکٹ کے تحت سولہ سال سے کم عمر میں لڑکی کا نکاح کرنا حرام ہے۔
- ii. جو لڑکی اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچ گئی ہو اور وہ "سوئی جیورس" بھی ہو تو وہ ولی کے بغیر نکاح کر سکتی ہے۔
- iii. فقہ حنفی کے مطابق لڑکی سترہ سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد نکاح میں داخل ہو سکتی ہے۔
- iv. ڈی ایف ملا کے مطابق لڑکی پندرہ سال کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔
- v. نکاح کے لئے بلوغت کا ہونا کافی نہیں بلکہ رشد کا ہونا بھی لازمی ہے۔

مندرجہ بالا صورت حال واضح کرنے کے بعد جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے حالیہ فیصلے کی روشنی میں وفاقی حکومت کو سندھ حکومت کی طرح نکاح کے لئے ایک خاص عمر مقرر کرنی چاہیے تاکہ لڑکی کے نکاح کے لئے کم سے کم عمر کے حوالے سے تمام شبہات ختم ہو سکیں اور ایسا کرنے پر شریعت کی جانب سے فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔

لڑکی کے نکاح کے لئے عمر کے مسئلہ کو تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد جسٹس صاحب کیس کی طرف واپس آئی ہیں اور لکھا ہے کہ چونکہ لڑکی کی عمر نکاح کے وقت سولہ سال سے زیادہ تھی تو چائلڈ میرج ریسٹریٹ ایکٹ اس پر لاگو نہیں ہو سکتا لیکن آئین کے آرٹیکل ۲۲ کے مطابق فقہ حنفی لڑکی پر لاگو ہوتا ہے۔ مزید برآں لڑکی سوئی جیورس بھی نہیں ہے تو ولی کا ہونا بھی لازمی تھا اور چونکہ مدعی کی جانب سے نکاح نامہ اور ایف ڈی ٹوٹ بھی جمع کرایا گیا ہے تو یہ کیس مزید انکوائری کا ہے اور اس وجہ سے مدعی کو ضمانت کا حقدار قرار دے کر ضمانت دی گئی۔

¹⁵⁷ Sui Juris: Anyone who has reached the age of majority, or is no longer a minor, is presumed to be sui juris.

¹⁵⁹ The Child Marriage Restraint Act, 1929

ہبہ اگٹ کے متعلق عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ¹⁶⁰

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ¹⁶¹

حقائق:

کلثوم بیگم نام کی مدعیہ نے ۱۹۲۷ میں ایک دیوانی مقدمہ دائر کیا جس کے مطابق مدعیہ کے والد فضل الہی ۱۹۷۱ کی جنگ میں شہادت پاگئے تھے اور والد کی شہادت کے وقت مدعیہ کی عمر ۳ سال تھی اور والد کی وفات کے بعد مدعیہ کا دادا احمد بھی ۱۹۸۷ میں وفات پاگئے تھے چونکہ مدعیہ کے والد مدعیہ کے دادا سے پہلے وفات پاگئے تھے تو اس وجہ سے مدعیہ نے مسلم فیملی لاز آرڈیننس کے دفعہ ۱۶۲ کے تحت اپنے دادا کے جائیداد میں وراثتی حصے کے لئے کیس کیا۔

مدعیہ کے وکیل کی جانب سے عدالت میں کہا گیا کہ مدعیہ کو اس کے دادا کی جائیداد میں وراثتی حصے سے محروم کرنے کے لیے مدعیہ کے چچاؤں محمد اسلم اور پیراں دتہ نے ایک جھوٹا ہبہ نامہ تیار کیا ہے جس کو ۷ جنوری ۱۹۷۵ کو رجسٹرڈ کیا گیا ہے جس کے مطابق مدعیہ کے دادا نے اپنی ساری جائیداد جو کہ کل ۱۲۹ کنال اور چودہ مرلے بنتی ہے کو مدعیہ کے چچاؤں یعنی اپنے بیٹوں کو ہبہ کر دیا تھا اور اسی ہبہ نامے کی بنیاد پر یونیورسٹی میں بھی ساری زمین کا انتقال مدعیہ کے چچاؤں کے نام پر کر دیا گیا تھا۔ مدعیہ نے اسی ہبہ نامے کو ختم کرنے اور دادا کی جائیداد میں اپنے وراثتی حصے کے لئے عدالت سے رجوع کیا۔ مدعیہ کے وکیل کی جانب سے مزید یہ دلائل دیئے گئے کہ چونکہ مدعیہ کا دادا ناخواندہ تھا اور اس وجہ سے ہبہ نامے پر ان کے انگھوٹے لگا جو نشان بتایا جاتا ہے تو وہ ثابت نہیں ہو سکا ہے اور اس کے علاوہ ہبہ نامے کے مطابق ہبہ کو قبول کرنے کا ذکر بھی ہبہ نامے میں نہیں ہے۔ ٹرائل کورٹ نے مدعیہ کے خلاف فیصلہ دیا جبکہ ڈسٹرکٹ کورٹ نے مدعیہ کے حق میں فیصلہ دیا جبکہ لاہور عدالت عالیہ نے مدعیہ کے خلاف فیصلہ دیا تو اس وجہ سے مدعیہ کو عدالت عظمیٰ سے رجوع کرنا پڑا۔ مدعا علیہ کے وکیل کی جانب سے عدالت میں یہ دلائل دیئے گئے کہ چونکہ عدالت عظمیٰ کے مشہور فیصلے اللہ رکھا بنام حکومت پاکستان میں مسلم فیملی لاز آرڈیننس کے دفعہ ۱۶۲ کو خلاف اسلام قرار دے کر اس دفعہ باطل قرار گیا تھا تو اس وجہ سے مدعیہ کا اپنے دادا کے جائیداد میں کوئی وراثتی حصہ نہیں بنتا۔ مدعا علیہ کی جانب سے مزید یہ کہا گیا محمد اسلم نے ہبہ نامے کو قبول کیا تھا اور یہ کہ ہبہ نامے میں کہا گیا ہے کہ جائیداد کا قبضہ مدعا علیہ کو حوالہ کیا گیا جو کہ بذات خود قبول کرنے کی نشانی ہے۔

عدالت کے سامنے مندرجہ ذیل سوالات تھے۔

1. کیا مسلم فیملی لاز آرڈیننس کا دفعہ ۱۶۲ عدالت عظمیٰ کے فیصلے کے بعد برقرار ہے یا نہیں؟
 2. کیا مدعا علیہ کی جانب سے ہبہ کو قبول کیا گیا تھا یا نہیں اور اگر نہیں کیا گیا تو ایسے ہبہ کا کیا حکم ہے؟
- عدالت نے اپنے فیصلے کا آغاز عدالت عظمیٰ کے مشہور فیصلے اللہ رکھا بنام حکومت پاکستان کے تفصیلی جائزے سے کیا ہے اور آخر میں یہ قرار دیا ہے کہ چونکہ مندرجہ بالا فیصلے کے خلاف شریعت اپیلٹ بینچ میں اپیل زیر سماعت ہے تو اس وجہ سے دفعہ ۱۶۲ برقرار ہے اور جب تک شریعت اپیلٹ بینچ کا فیصلہ نہیں آتا تو تب تک یہ دفعہ نافذ العمل رہے گا۔
- دفعہ ۱۶۲ مسلم فیملی لاز آرڈیننس کی وضاحت کے عدالت عظمیٰ نے دوسرے سوال کا جواب ڈی ایف ملا کی مجنن لا کے سیکشن ۱۱۴۹ اور ۱۵۰ سے کیا ہے جس کے مطابق کسی بھی ہبہ نامے کے لئے مندرجہ ذیل تین ارکان کا ہونا لازمی ہے۔

1. ڈونر یعنی ہبہ دینے والے کا ہبہ دینے کا اعلان۔
2. ہبہ کو صراحتاً یا اشارتاً قبول کرنا۔
3. ہبہ میں دی جانے والی چیز کا قبضہ منتقل کر دینا۔

¹⁶⁰ This Important Judgement Is Written by Justice Qazi Faiz Isa and Can be Searched and Cited As 2022 SCMR 1352.

¹⁶¹ ایڈووکیٹ پشاور بار ایسوسی ایشن و ممبر قانون دان پشاور ٹیم

¹⁶² **4. Succession.** In the event of death of any son or daughter of the propositus before the opening of succession, the children of such son or daughter, if any, living at the time the succession opens, shall per stripes, receive a share equivalent to the share which such son or daughter would have received if alive.

چونکہ مدعیہ کا دعویٰ یہ تھا کہ ہبہ کی تکمیل کے لیے ہبہ کی قبولیت ضروری ہے جو کہ اس کیس میں کسی کی جانب سے قبول کی نہیں گیا جبکہ دوسری طرف مدعا علیہ کا کہنا تھا کہ اس کو محمد اسلم نامی ڈونی قبول کر چکا ہے لیکن ہبہ نامے پر ڈونر کے ساتھ ساتھ محمد اسلم کا دستخط تو موجود ہے لیکن محمد اسلم کے ساتھ یہ تفصیل نہیں ہے کہ کیا وہ بطور گواہ دستخط کر رہا ہے یا بطور ہبہ قبول کرنے کے دستخط کر رہا ہے جبکہ اس کے علاوہ کسی بھی مدعا علیہ کے بیان میں بھی ہبہ کو قبول کرنے کا ذکر نہیں ہے تو اس وجہ سے یہ بات واضح ہے کہ اس ہبہ کو قبول نہیں کیا گیا ہے جبکہ قبضے والی بات کے حوالے سے جسٹس صاحب کا کہنا ہے کہ اس کیس میں قبضہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے کیونکہ مدعا علیہ کے باپ کی جائیداد ہے تو اس وجہ سے لازمی بات ہے کہ قبضہ بھی ان کے پاس ہوگا۔ سوالات کی وضاحت کے بعد عدالت عظمیٰ نے چند مزید اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ فیصلے میں کہا گیا ہے کہ ہبہ نامے کو ثابت کرنے کا بار ثبوت مدعا علیہ پر تھا کیونکہ اس ہبہ نامے کا فائدہ مدعا علیہ پر تھا اور اسی وجہ سے ڈسٹرکٹ کورٹ نے بھی مدعا علیہ پر ثابت کرنے کے خلاف فیصلہ دیا لیکن ہائی کورٹ نے قرار دیا تھا کہ چونکہ مدعیہ کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کے ساتھ اس کے چچاؤں نے دھوکہ دہی کی ہے تو اس وجہ سے دھوکہ دہی کو ثابت کرنا مدعیہ کا کام تھا اور یہاں ہائی کورٹ کے فیصلے کے بارے میں مزید لکھا گیا کہ وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ اصل مسئلہ ہبہ نامے کا تھا کیونکہ اگر ہبہ نامہ نہ ہوتا تو دفعہ ۴ مسلم فیملی لاز آرڈیننس کی وجہ سے تو مدعیہ بغیر کسی کیس کے جائیداد میں حقدار بن جاتی تو اس وجہ سے ہبہ نامے کو ثابت کرنے کا بار ثبوت مدعا علیہ پر تھا اور چونکہ وہ اس ہبہ نامے کو ثابت بھی نہیں کر پائے اور دوسری بات ہبہ نامہ کو قبول بھی نہیں کیا گیا تھا تو اس وجہ سے احمد یعنی دادا کی وفات کے بعد دفعہ ۴ مسلم فیملی لاز آرڈیننس کے تحت ہوتی تہب بھی دادا کے جائیداد میں حقدار ہے۔

نوٹ: عدالت عظمیٰ کی جانب سے یہ فیصلہ اس لحاظ سے انتہائی خوش آئند اور شاندار ہے کیونکہ اس میں عورتوں کو ان کے شرعی اور قانونی وراثت سے برزیرہ جعلی ہبہ ڈیڈ کے محروم کرنے کے راستے کی نفی کی گئی ہے۔

حق حضانت کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کا ایک اہم فیصلہ¹⁶³

ذوالقرنین ایڈووکیٹ¹⁶⁴

حقوق:

راجہ محمد اویس نامی مدعی (شوہر) کی شادی نازیہ جبین (بیوی) نامی مدعا علیہ کے ساتھ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں چار بچے پیدا ہوئے جن میں فیضان، رابعہ، عائشہ اور امامہ جن کی عمر بالترتیب ۸، ۱۳، ۱۶ اور ۱۷ سال ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان شادی طلاق کے زریعے ۲۰۱۷ میں اپنے اختتام کو پہنچتی ہے جس کے مدعیہ اپنے چاروں بچوں کی حضانت کے لئے فیملی کورٹ سے رجوع کرتی ہے۔ ٹرائل کے دوران ایک تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ مدعا علیہ یعنی نازیہ جبین نے دوسری شادی کی ہوئی ہے اور اس کے دوسرے شوہر کے پہلی بیوی سے چار بچے ہیں جو کہ چاروں بالغ ہیں اور دوسری بات یہ سامنے آجاتی ہے کہ ٹرائل کے دوران ہی مدعی کی دو بیٹیاں عائشہ اور امامہ اپنے والد کو چھوڑ کر اپنی والدہ کے پاس چلی جاتی ہیں۔ ٹرائل کورٹ یعنی فیملی کورٹ تقریباً دو سال کے عرصے تک کیس چلانے کے بعد بالآخر نازیہ جبین کے حق میں فیصلہ کرتی ہے اور چاروں بچوں کو ماں کے حوالے کرنے کا حکم دے دیتی ہے۔ فیملی کورٹ کے فیصلے کو مدعی یعنی راجہ محمد اویس ڈسٹرکٹ کورٹ میں اس بنیاد پر چیلنج کر دیتا ہے کہ مدعا علیہ نے دوسری شادی کی ہوئی ہے اور اس کے دوسرے شوہر کے پہلے سے چار بیٹے ہیں تو اس بنیاد پر ڈسٹرکٹ کورٹ مدعی یعنی راجہ محمد اویس کے حق میں فیصلہ کر کے تمام بچے اس کو واپس دینے کا حکم صادر کر دیتی ہے۔ ڈسٹرکٹ کورٹ کے فیصلے کو مدعا علیہ یعنی نازیہ جبین لاہور عدالت عالیہ میں چیلنج کر دیتی ہے اور لاہور عدالت عالیہ ٹرائل کورٹ کا فیصلہ واپس برقرار رکھنے کا حکم صادر کر کے بچے ماں کو واپس دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ لاہور عدالت عالیہ کے فیصلے کے خلاف مدعی یعنی راجہ محمد اویس عدالت عظمیٰ سے رجوع کرتا ہے اور یوں اس کیس کا آغاز ہوتا ہے۔

عدالت عظمیٰ کے سامنے بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا دوسری شادی کرنے سے مدعا علیہ یعنی نازیہ جبین کا حق حضانت ختم ہو جاتا ہے یا نہیں؟

مدعی کے وکیل کی جانب سے سارا زور اس ایک بات پر ہوتا ہے کہ مدعا علیہ کی دوسری شادی کے نتیجے میں اس کا حق حضانت ختم ہو گیا ہے اور دوسری بات یہ کی جاتی ہے کہ چونکہ بچوں کے والد نے ایک تو دوسری شادی نہیں کی اور دوسری بات کہ وہ اچھی نوکری پر ہے تو اس لئے بچوں کی بہتری اس میں ہے کہ حق حضانت مدعی کو دیا جائے اور بچوں کا والد اس

¹⁶³ This Judgement Is Written by Justice Ayesha A. Malik And Can Be Searched and Cited As 2022 SCP 289.

¹⁶⁴ ایڈووکیٹ و ممبر قانون دان ٹیم پشاور

دوران خود بھی کورٹ کے سامنے یہ بات رکھتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی نوجوان بیٹیاں کیسے بچوں کی ماں کے دوسرے شوہر کے نوجوان بچوں کے ساتھ کیسے ایک گھر میں رہ سکتی ہیں۔ دوسری جانب مدعا علیہ یعنی نازیہ جبین کے وکیل کی جانب سے دوسرے شوہر والی بات کے جواب میں کہا گیا کہ مدعا علیہ نے دوسری شادی کی ہے لیکن مدعا علیہ ایک الگ گھر میں رہاںش پذیر ہے اور مدعا علیہ کے دوسرے شوہر کا خاندان الگ گھر میں رہاںش پذیر ہے۔ مدعا علیہ کے وکیل کا مزید کہنا تھا کہ چونکہ بچے خود بھی والدہ کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور بچوں کی ماں ایک تعلیم یافتہ عورت ہے اور اپنا ایک سکول چلا رہی ہیں تو بچوں کی بہتری اس میں ہے کہ بچوں کا حق حضانت مدعا علیہ کو دیا جائے۔

عدالت عظمیٰ نے دلائل سننے کے بعد فیصلے کے دلائل کا آغاز ڈی ایف ملا کی مٹھان لاکے پیرا نمبر ۳۵۲ سے کیا ہے جس کے مطابق بچوں کی کسٹڈی کا حق سات سال تک والدہ کے پاس ہوتا ہے لیکن اگر والدہ دوسری شادی کرتی ہے تو اس کا حق حضانت ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جسٹس صاحبہ نے گارڈین اینڈ وارڈز ایکٹ کے فوٹے ۱۶۵ کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق حق حضانت کا فیصلہ بچوں کی بہتری کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ اس کے بعد جسٹس صاحبہ عدالت عظمیٰ کے ایک فیصلے کا حوالہ دے کر لکھتی ہیں کہ اس کیس کے مطابق عموماً دوسری شادی کرنے سے حق حضانت ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ اصول حتمی نہیں ہے اور حضانت کا فیصلہ بچوں کی بہتری کو دیکھ کر کیا جائے گا۔ اس کے بعد تین مزید فیصلوں¹⁶⁶ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسری شادی سے حق حضانت ختم ہونے کا اصول قطعی نہیں ہے بلکہ دوسری شادی کے بعد بھی اگر بچے کی بہتری والدہ کے ساتھ رہنے میں تو حق حضانت والدہ کو دیا جائے گا اور یوں مدعی کی جانب سے یہ دعویٰ کہ دوسری شادی سے بچوں کی ماں کا حق حضانت ختم ہو جاتا ہے تو یہ دعویٰ غلط ہے بلکہ حق حضانت کا فیصلہ ہمیشہ بچوں کی بہتری کو دیکھ کر کیا جائے گا۔ بچوں کی حضانت دینے کے لیے کوئی حساب کتاب اصول نہیں ہے بلکہ بچوں کی بہتری جہاں ہوگی تو حق حضانت اس کو دیا جائے گا اور اس کے بعد جسٹس صاحبہ نے ان عوامل کا ذکر کیا ہے جس سے بچوں کی بہتری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس میں بچوں کی جسمانی اور ذہنی بہتری شامل ہے۔

عدالتی فیصلوں کے ذکر کے بعد عدالت نے فیصلے میں بچوں کے حقوق کے لیے اقوام متحدہ کے کنونشن¹⁶⁷ کا ذکر کیا جو کہ پاکستان نے ۱۹۹۰ میں کچھ تحفظات کے ساتھ دستخط کیا تھا لیکن بعد میں ۱۹۹۷ میں پاکستان نے وہ تحفظات واپس لے لی تھیں۔ فیصلے میں عدالت نے کنونشن کے آرٹیکل ۹، ۷، ۳ اور ۱۲ کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ حق حضانت میں بچوں کی مرضی کو ترجیح دی جائے گی اور آخر میں نتیجہ یہ نکالا ہے کہ اکیلے دوسری شادی سے حق حضانت ختم نہیں ہوتا۔

فیصلے کے آخر میں عدالت نے لکھا ہے کہ چونکہ مدعا علیہ یعنی نازیہ جبین ایک تعلیم یافتہ عورت ہے اور وہ اپنا ایک سکول بھی چلا رہی ہیں اور ایک الگ گھر میں بھی رہاںش پذیر ہے اور بچوں کی اپنی مرضی بھی یہ ہے کہ وہ والدہ کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس موقع پر عدالت نے خود بھی تمام بچوں سے ان کی مرضی پوچھی جس میں تمام بچوں کا جواب والدہ کے حق میں تھا تو ان وجوہات کو دیکھتے ہوئے عدالت نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے بچوں کی حضانت والدہ یعنی نازیہ جبین کے پاس برقرار رکھنے کا فیصلہ سنایا۔

¹⁶⁵ **17. Matters to be considered by the Court in appointing guardian.** __ (1) In appointing or declaring the guardian of a minor, the Court shall, subject to the provisions of this section, be guided by what, consistently with the law to which the minor is subject, appears in the circumstances to be for the welfare of the minor. (2) In considering what will be for the welfare of the minor, the Court shall have regard to the age, sex and religion of the minor, the character and capacity of the proposed guardian and his nearness of kin to the minor, the wishes, if any, of a deceased parent, and any existing or previous relations of the proposed guardian with the minor or his property. (3) If the minor is old enough to form an intelligent preference, the Court may consider that preference. (5) The Court shall not appoint or declare any person to be a guardian against his will.

¹⁶⁶ 2004 SCMR 990, PLD 2002 SC 267, 2014 SCMR 343.

¹⁶⁷ Convention on the Rights of the Child.

باپ کی نرندگی میں ہی فوت ہونے والے بیٹے کی بیوہ کے میراث کے حوالے سے پشاور عدالت عالیہ کا ایک اہم فیصلہ¹⁶⁸

ذوالقرنین ایڈووکیٹ¹⁶⁹

مسمات حیات بیگم اپنے شوہر مومن خان کی وفات کے بعد سول جج کی عدالت میں دعویٰ استقرار حق دائر کر کے عدالت سے یہ استدعا کرتی ہے کہ وہ مومن خان کی بیوہ کی حیثیت سے اپنے سرسری مومن خان کے والد کے ساتھ وراثت میں دفعہ ۴ مسلم فیملی لاز آرڈیننس¹⁷⁰ کے تحت اس لئے شریک ہے کہ اس کا مرحوم شوہر اپنے باپ کی زندگی میں ہی فوت ہو گیا تھا۔ ٹرائل کی تکمیل کے بعد سول جج صاحب نے حیات بیگم کو اس کے شوہر کی جائداد میں چوتھائی حصے کا حق دار قرار دے دیا لیکن دفعہ ۴ کے تحت اپنے سرسری وراثت میں شریک ٹہرائے جانے والی استدعا کو مسترد کر دیا اور یہ قرار دے دیا کہ دفعہ ۴ کے تحت حیات بیگم سرسری میراث میں اپنے شوہر کے حصے کی حقدار نہیں ہے اور اس حد تک دعویٰ کو خارج بھی کر دیا۔ ٹرائل کورٹ کے فیصلے کے خلاف دونوں فریقین نے اپیلٹ کورٹ سے رجوع کیا اور بالا خرچ اپیلٹ کورٹ نے حیات بیگم کے اپیل کو بھی خارج کر دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے فریق کی اپیل منظور کر کے حیات بیگم کو چوتھائی حصے سے بھی محروم کر دیا اور یوں یہ کیس عدالت عالیہ پہنچ گیا۔

عدالت عالیہ میں اس کیس کی ابتداء اس مختصر سوال سے ہوئی کہ کیا باپ کی زندگی میں ہی فوت ہو جانے والے بیٹے کی بیوہ کو دفعہ ۴ مسلم فیملی لاز آرڈیننس کے تحت میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

مندرجہ بالا سوال کے جواب میں مدعیہ یعنی حیات بیگم کے وکیل نے عدالت عظمیٰ کے فیصلے¹⁷¹ اور لاہور عدالت عالیہ کے فیصلے پر انحصار کرتے ہوئے کہا کہ مسمات حیات بیگم دفعہ ۴ کے تحت مومن خان کی بیوہ کی حیثیت سے اپنے سرسری میراث میں شریک ہے۔ مدعیہ کے وکیل کے دلائل کم ہونے کے بعد پشاور عدالت عالیہ نے اپنے فیصلے کا آغاز دفعہ ۴ کی موجودہ حیثیت سے کیا ہے اور اس ضمن میں وفاقی شرعی عدالت کے مشہور زمانہ کیس اللہ رکھا ذکر کر کے یہ بات لکھی کہ اس سیکشن کو وفاقی شرعی عدالت اسلامی احکامات سے متصادم قرار دے چکی ہے لیکن مندرجہ بالا فیصلہ عدالت عظمیٰ کے سامنے چیلنج ہو جانے کی وجہ سے قابل عمل نہیں ہے اور یوں دفعہ ۴ اپیل کے مکمل ہونے تک فعال ہے۔ دفعہ ۴ کے قابل عمل ہونے کی وضاحت کے بعد پشاور عدالت عالیہ نے دفعہ ۴ کا جائزہ لیا ہے اور اس کے پیچھے مقننہ کی سوچ کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد یہ سوال رکھا ہے کہ کیا ہوتے اور ہوتی کے علاوہ دیگر ورثاء کو اس سیکشن سے کوئی فائدہ مل سکتا ہے یا نہیں اور اس کا جواب یہ دیا ہے دفعہ ۴ کے تحت پوتے اور پوتیوں کے علاوہ اس میں اور کسی کو شامل نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی کسی اور طرح سے تشریح کی جاسکتی ہے اور اسی وجہ سے باپ کی زندگی میں فوت ہونے والے بیٹے کی بیوہ کو سرسری میراث میں شریک نہیں ٹہرایا جاسکتا۔

اس کے بعد مدعیہ کے وکیل کی جانب سے پیش کئے جانے والے عدالتی نظائر کا بخوبی جائزہ لیا ہے اور اس سب کے جسٹس صاحب نے دفعہ ۲ مسلم پرسنل لائبریریٹ اپلیکیشن ایکٹ¹⁷² اور دفعہ ۴ کا تقابلی جائزہ لے کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دفعہ ۴ کی تشریح دفعہ ۲ کی روشنی میں کی جائے گی اور دفعہ ۴ کے تحت پوتے اور پوتیوں کو ملنے والے حصے بھی اگر میراث کے حصوں سے متصادم ہوں تو شریعت کو فوقیت دی جائے گی اور اس بابت جسٹس صاحب نے پشاور عدالت عالیہ کے فیصلے¹⁷³ پر انحصار کیا ہے۔ مندرجہ بالا تمام وجوہات کے ذکر کے بعد جسٹس صاحب نے مسمات حیات بیگم کا کیس خارج کر دیا۔ اس اہم کیس لاکھ خلاصہ کچھ یوں ہے کہ دفعہ ۴ مسلم فیملی لاز آرڈیننس صرف پوتے اور پوتیوں کی حد تک

¹⁶⁸ This Important Judgement Is Written by Justice Muhammad Naeem Anwar of Peshawar High Court and Can Be Searched and Cited as PLD 2023 Peshawar 6.

¹⁶⁹ ایڈووکیٹ، پشاور بار ایسوسی ایشن۔

¹⁷⁰ 4. **Succession.** In the event of death of any son or daughter of the propositus before the opening of succession, the children of such son or daughter, if any, living at the time the succession opens, shall per stripes, receive a share equivalent to the share which such son or daughter would have received if alive.

¹⁷¹ 2005 SCMR 1595

¹⁷² West Pakistan Muslim personal Law (Shariat) Application Act, 1962.

¹⁷³ 2015 MLD 652 PESH

ہے اور ان کے علاوہ اس سیکشن سے کسی دوسرے رشتے کو فائدہ نہیں مل سکتا اور پوتے پوتیوں کا حصہ بھی اگر شریعت میں ذکر شدہ حصوں سے متضاد ہو تو شریعت کو فوقیت حاصل ہوگی۔

وراثت کے مقدمات میں میعاد سماعت کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کا ایک انتہائی اہم فیصلہ¹⁷⁴

محمد ذوالقرنین 175

فیصلے کی تفصیل میں جانے سے پہلے قارئین کی اطلاع اور آسانی کے لئے غرض یہ ہے کہ یہ وہ مشہور فیصلہ ہے جس کی بازگشت اخبارات اور میڈیا چینلز پر ۲۳ ستمبر ۲۰۲۱ کو چلنے والی ایک پریس ریلیز تھی جس کے مطابق اگر بہنیں اپنے بھائیوں سے اپنا حصہ اپنی زندگی میں نہ مانگیں تو ان کی اولاد ان کی وفات کے بعد نہیں مانگ سکتی اور بالآخر تقریباً ڈیڑھ سال کے انتظار کے بعد عدالت عظمیٰ نے بائیس مارچ دو ہزار تیس کو مندرجہ بالا ذکر شدہ سوال کا تفصیلی فیصلہ جاری کر دیا۔

کیس کے حقائق:

عمیسی خان ولد حمید اللہ جو کہ جائیداد مندرجہ، ۱۹ کنال اور ۷ امر لے کا مالک تھا، کی وفات کے بعد اس کی جائیداد انتقال نمبر ۷۳۲ کے ذریعے ت ۲۳ مارچ ۱۹۳۵ میں اس کے بیٹے عبد الرحمن کو منتقل ہوئی۔ ۱۹۶۰/۶۱ میں جائیداد مندرجہ میں سے کچھ جائیداد سماں انڈسٹریز کارپوریشن نے حاصل کی جس کا باقاعدہ معاوضہ عبد الرحمن کو ملا۔ عبد الرحمن کے انتقال یعنی فوت ہونے کے بعد جائیداد مندرجہ اس کے اولاد اور بیوہ کو منتقل ہوئی جو کہ انھوں نے تقریباً تمام کی تمام آگے اور لوگوں کو ریکارڈ کے مطابق بیچ دی۔ یہاں تک تو بات بڑی آسان تھی لیکن پھر ۲۰۰۳ آیا اور ۱۹ نومبر ۲۰۰۳ کو سعادت خان وغیرہ نے سول کورٹ پشاور میں ۲۳ مارچ ۱۹۳۵ کو عبد الرحمن کے حق میں کئے گئے انتقال کو اس وجہ سے چیلنج کیا کہ عمیسی خان کی وفات کے وقت عبد الرحمن کے علاوہ دو بیٹیاں بھی تھیں جن کے نام بالترتیب مسماں مہر اور افسروہیں لیکن عبد الرحمن نے دھوکہ دہی کے ذریعے اپنی بہنوں کو جائیداد سے محروم کیا اور یہ کہ عبد الرحمن کے ورثاء سے کافی دفعہ مطالبہ کیا گیا کہ مسماں مہر اور افسروہیں کے ورثاء کو ان کا حق دیا جائے لیکن شروع میں عبد الرحمن کے ورثاء نال مثول سے کام لیتے رہے اور آخر کار انھوں نے حصہ دینے سے صراحتاً انکار کر دیا تو اس لئے ۱۹۳۵ کے انتقال نمبر ۷۳۲ اور اس کی وجہ سے واقع ہونے والے تمام انتقال کو منسوخ کیا جائے۔

مسماں مہر اور افسروہیں کے ورثاء کی جانب سے ۲۰۰۳ میں جب سول کورٹ میں دعویٰ استقرار حق کے ذریعے ۱۹۳۵ کے انتقال نمبر ۷۳۲ کو چیلنج کیا گیا تو اس کے جواب میں عبد الرحمن کے ورثاء یعنی شاہد الرحمان وغیرہ نے یہ جواب دیا کہ ۱۹۳۵ کا انتقال اس وقت کے قانون کے بالکل مطابقت میں ہوا ہے اور یہ کہ تب سے ہم زمین پر بحیثیت ملک قابض و متصرف ہیں اور یہ کہ جب ہمیں سماں انڈسٹریز کارپوریشن کی طرف سے معاوضہ ملا تو یہ بات مدعیان کے علم میں تھی اور اسی لئے یہ مقدمہ میعاد سماعت کے خاتمے کی وجہ سے قابل سماعت نہیں ہے۔

سول جج یعنی ٹرائل کورٹ نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد ۲۸ جنوری ۲۰۱۲ کو مدعیان یعنی مسماں مہر اور افسروہیں کے ورثاء کے حق میں فیصلہ کر دیا اور دعویٰ قابل سماعت نہ ہونے کے متعلق یہ کہا کہ وراثت کے مقدمات میں میعاد سماعت¹⁷⁶ لاگو نہیں ہوتا۔ ٹرائل کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف عبد الرحمن کے ورثاء یعنی شاہد الرحمان وغیرہ نے اپیل میں ڈسٹرکٹ جج سے رجوع کیا جہاں پر ڈسٹرکٹ جج نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد اپیلانٹ یعنی عبد الرحمن کے ورثاء میں اس بنیاد پر فیصلہ دیا کہ مسماں مہر اور افسروہیں نے باوجود اس بات کا علم ہونے کے کہ عبد الرحمن کو سماں انڈسٹریز کارپوریشن سے معاوضہ ملا ہے، انتقال نمبر تین سو تیس کو چیلنج نہیں کیا تو اس لئے ڈسٹرکٹ جج نے ٹرائل کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے کیس کا فیصلہ عبد الرحمن کے ورثاء کے حق میں کر دیا جس کے خلاف مسماں مہر اور افسروہیں کے ورثاء نے پشاور ہائی کورٹ میں نظر ثانی کی درخواست دائر کر دی لیکن ہائی کورٹ نے بھی عدالت عظمیٰ کے مختلف نظائر پر انحصار کرتے ہوئے نظر ثانی کی درخواست خارج کر دی اور ڈسٹرکٹ جج کا فیصلہ برقرار رکھا جس کے

¹⁷⁴ اس اہم فیصلے کے مصنف جسٹس منصور علی شاہ ہیں اور اسے 2017 کی سول پیٹیشن نمبر 262-پنی کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

¹⁷⁵ ایڈووکیٹ، پشاور بار ایسوسی ایشن

بعد مسامت افسرو اور مہرو کے ورثاء نے لیوٹو ایتیل¹⁷⁷ میں عدالت عظمیٰ سے رجوع کر کے ڈسٹرکٹ جج اور ہائی کورٹ کے فیصلے کو چیلنج کر دیا اور یوں اس کیس کی ابتداء عدالت عظمیٰ میں ہوئی۔

عدالت عظمیٰ میں مدعیان یعنی مسامت افسرو اور مہرو کے ورثاء کے وکلاء کی جانب سے یہ بنیادی نکتہ اٹھایا گیا کہ ٹرائل کورٹ نے بالکل درست طور پر یہ اصول لاگو کیا تھا کہ انتقال وراثت میں میعاد سماعت نافذ نہیں ہوتا جبکہ ڈسٹرکٹ جج اور ہائی کورٹ نے میراث کے کیس میں میعاد سماعت لاگو کر کے غلطی کی ہے اور اپنے اس نکتے کے حق میں مدعیان نے عدالت عظمیٰ کے مختلف عدالتی نظائر کا سہارا بھی لیا ہے۔ عدالت عظمیٰ نے اپنے سامنے سب سے پہلا سوال یہ رکھا ہے کہ کیا میراث کے مقدمات میں میعاد سماعت کا اصول لاگو ہوتا ہے یا نہیں کیونکہ عدالت عالیہ کے فیصلے کے مطابق میراث کے مقدمات میں میعاد سماعت کا اصول لاگو ہوتا ہے جب کہ ٹرائل کورٹ اور مدعیان کے وکیل کے مطابق میعاد سماعت کا اصول لاگو نہیں ہوتا اور اسی لئے عدالت عظمیٰ نے سب سے پہلے فریقین اور عدالت عالیہ کی جانب سے پیش کئے جانے والے عدالتی نظائر کا جائزہ لینے سے کیا ہے کہ کیا دونوں طرف سے پیش کئے جانے والے عدالتی نظائر میں کہیں کوئی تضاد تو نہیں ہے اور جائزہ لینے کے بعد عدالت عظمیٰ کے مطابق نظائر میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

عدالتی نظائر کا جائزہ لینے کے بعد عدالت عظمیٰ نے اپنے فیصلے کا آغاز لمیٹیشن ایکٹ¹⁷⁸ کے آرٹیکل ۱۲۰ سے کیا ہے جس کے مطابق لمیٹیشن ایکٹ میں کسی مقدمے کے لئے اگر میعاد سماعت نہیں ہے تو ان تمام مقدمات میں میعاد سماعت ۶ سال شمار ہوگی اور چونکہ انتقال وراثت کے دعویٰ استقرار حق کے لیے بھی میعاد مقرر نہیں ہے تو اس لئے اس کیس میں بھی میعاد سماعت ۶ سال ہوگی اور اگر کوئی عورت اپنے بھائیوں کے خلاف والد کی جائداد میں وراثت کا دعویٰ کرتی ہے تو ایسے کیس میں میعاد سماعت ۶ سال شمار ہوگی۔

عدالت عظمیٰ نے وراثت کے مقدمات میں میعاد سماعت کا معممہ واضح کرنے کے بعد اپنے سامنے یہ سوال رکھا ہے کہ یہ ایک بات تو واضح ہوگی کہ میراث کے مقدمات میں میعاد سماعت چھ سال ہے لیکن اب اصل سوال یہ ہے کہ یہ چھ سال شروع کب سے ہوں گے۔ میعاد سماعت کے شروع ہونے کی بات ہر کیس کے حالات اور واقعات پر منحصر ہے کیونکہ میعاد سماعت یا تو وراثت میں حصہ دینے سے واضح انکار اور یا وراثت سے محروم کرنے کی دھمکی سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد عدالت عظمیٰ نے وراثت میں حصہ دینے سے انکار اور انکار کی دھمکی پر سیر حاصل بحث کی ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ صریح انکار کی صورت میں انکار سے ہی میعاد سماعت کا آغاز ہوگا جبکہ انکار کی دھمکی کی صورت میں ہر دھمکی سے بنائے دعویٰ حاصل ہوگا۔ مندرجہ بالا نکات کی وضاحت کے بعد عدالت عظمیٰ نے ایک اور اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صریح انکار کا پیمانہ اجنبی لوگوں کے درمیان الگ جبکہ بہن بھائیوں کے درمیان الگ ہے کیونکہ موخر الذکر رشتہ اعتماد کا رشتہ ہے اور پھر بہن بھائیوں کے درمیان صریح انکار کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ صرف زبانی انکار کو صریح انکار نہیں سمجھا جائے گا بلکہ جب تک کوئی واضح قدم دوسرے کو جائیداد سے محروم کرنے کے لیے نہ اٹھایا جائے تو تب تک بنائے دعویٰ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے بعد عدالت عظمیٰ نے بھائیوں پر بہنوں کے حقوق بطور شریک کا جائزہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں غلام علی کیس کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اسلامی قانون کی روشنی میں میراث بغیر کسی انتقال اور بغیر کسی تاخیر کے فی الفور مورث کی وفات کے بعد تمام ورثا کو منتقل ہو جاتی ہے اور اس کے بعد بہن بھائیوں کے کیس میں صریح انکار کی ایک دو صورتیں بیان کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر بھائی بغیر اجازت کے دوسروں کو جائیداد فروخت کرنا شروع کریں یا کوئی جعلی تملیک سے انتقال ظاہر کریں تو بھائیوں کے یہ کام صریح انکار کی مد میں آئیں گے اور بہنیں ان پر مقدمہ کر سکتی ہیں لیکن اگر بھائی دھوکہ دہی کے ذریعے بہنوں کے علم میں لائے بغیر مندرجہ بالا اقدامات کریں تو ایسی صورت میں بہنوں کی میعاد سماعت کا آغاز بھائیوں کی دھوکہ دہی کا علم ہونے کے بعد ہوگا۔ اس کے بعد عدالت عظمیٰ نے دھوکہ دہی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بھائیوں کا کوئی واضح قدم دھوکہ دہی کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

انتقال وراثت کے مقدمات میں میعاد سماعت کے تمام اصولوں پر تفصیلی بحث کے بعد عدالت اس کیس کی طرف واپس آئی ہے اور تمام حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اس مقدمے میں میعاد سماعت کا آغاز سال انڈسٹریز کارپوریشن کی جانب سے انیس سو ساٹھ اکتھ میں عبدالرحمن کو معاوضہ کی ادائیگی ہے کیونکہ یہ واضح اقدامات تھے جن کا علم مسامت افسرو اور مہرو کو بھی تھا اور یہ بات ریکارڈ میں سعادت خان کے بیان سے بھی واضح تھی جس کے مطابق انھوں نے عبدالرحمن سے جائیداد کے عوض پیسوں کا مطالبہ بھی کیا لیکن عبدالرحمن نے واضح انکار کیا اور عبدالرحمن کی جانب سے سال انڈسٹریز کارپوریشن سے معاوضہ لینا جائیداد متدعوئیہ کو بیچنے کے مترادف تھا اور مسامت افسرو اور مہرو کو پیسے دینے سے انکار واضح بنائے دعویٰ تھا اور اسی لئے میعاد سماعت کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے اور میعاد سماعت کا خاتمہ ۱۹۶۷ء یا ۱۹۶۸ء میں ہو گیا تھا اور اسی لئے میعاد سماعت کا

¹⁷⁷ Leave to appeal.

¹⁷⁸ THE LIMITATION ACT, 1908 (IX of 1908)

خاتمہ مسات افسر اور مہر و کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا اور مندرجہ بالا نکات پر غور کرنے کے بعد عدالت عظمیٰ نے ڈسٹرکٹ جج اور ہائی کورٹ کے فیصلوں کو برقرار رکھتے ہوئے مدعیان کی درخواست خارج کر دی۔

عدالت عظمیٰ کے اس انتہائی اہم فیصلے کا خلاصہ یہ ہے کہ وراثت کے مقدمات میں بھی میعاد ساعت کا اصول لاگو ہوگا اور لمیٹیشن سن ایکٹ کے آرٹیکل ۱۲۰ کی رو سے وراثت کے مقدمات میں میعاد ساعت ۶ سال ہوگی اور ان ۶ سالوں کا آغاز یا تو جائیداد میں حصہ دینے سے صراحتاً انکار اور یا انکار کی دھمکی سے ہوگا اور اگر دھوکہ دہی کا عنصر آجائے تو پھر میعاد ساعت کا آغاز دھوکہ دہی کا علم ہونے کی تاریخ سے ہوگا۔

نوٹ: عدالت عظمیٰ کے مندرجہ بالا فیصلے کی بازگشت جب آج سے ڈیڑھ سال پہلے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے سنائی دی تو پورے ملک میں ایک ہلچل برپا ہو گئی تھی اور ہر طبقے نے اپنے مطابق اس پریس ریلیز پر روشنی ڈالی تھی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ عدالت عظمیٰ کو یہ فیصلہ جاری کرنے میں ڈیڑھ سال لگے لیکن سب سے افسوس ناک امر یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ نے اس فیصلے میں اپنے حال ہی میں طے شدہ اس اصول کی خلاف ورزی کی ہے کہ فیصلوں پر تاریخ فیصلہ واضح طور پر لکھا جائے گا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ فیصلہ عدالت عظمیٰ کی ویب سائٹ پر ۲۲ مارچ ۲۰۲۳ کو اپلوڈ ہوا جبکہ فیصلے پر اس کی تاریخ ۲۳ ستمبر ۲۰۲۱ ہے۔ اس فیصلے میں قانون کے طلباء کے لئے جو دوسری اہم بات ہے تو وہ یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ کے حالیہ فیصلوں میں یہ بات دن بدن نمایاں ہوتی جا رہی ہے کہ وراثت کے مقدمات میں بھی میعاد ساعت کا اصول لاگو ہوگا جس کے ایک طرف کی فائدے ہیں جن میں سرفہرست یہ ہے کہ عدالتوں میں زیر التوا وراثت کے مقدمات میں کافی کمی آئے گی لیکن ساتھ میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا میعاد ساعت کا یہ اصول ہمارے معاشرے اور اسلامی قانون وراثت سے مطابقت میں ہے اور کیا یہ اصول دراصل خواتین کو اپنے جائز حق وراثت سے محروم کرنے کا باعث تو نہیں بن رہا؟

بیوی چھوڑ کے حق نان و نفقہ کے حوالے سے لاہور عدالت عالیہ کا ایک اہم فیصلہ¹⁷⁹

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ¹⁸⁰

حقوق:

مریم بی بی نامی مدعیہ کی جانب سے سامان جہیز وغیرہ اور اپنے اور بچوں کے نان و نفقہ کی وصولی کے لئے اظہر اقبال نامی مدعا علیہ کے خلاف فیملی کورٹ میں دعویٰ دائر کیا جاتا ہے جس پر فیملی کورٹ باقاعدہ کاروائی کے بعد باقی چیزوں کے فیصلے کے علاوہ یہ فیصلہ بھی کرتی ہے کہ مدعا علیہ بچے کے نان و نفقہ کے طور پر ۵ ہزار روپے ماہانہ مدعیہ کو ادا کرنے کا بعد ہوگا۔ فیملی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف دونوں فریقین نان و نفقہ کی حد تک اپیل میں جاتے ہیں لیکن دونوں فریقین کی اپیلیں بھی خارج ہو جاتی ہیں جس پر مدعیہ نان و نفقہ کی حد تک لاہور عدالت عالیہ سے رجوع کرتی ہے۔ یہاں پر یاد رہے کہ عدالت عالیہ کے سامنے ایک ہی سوال تھا کہ کیا فیملی کورٹ نے جو نان و نفقہ مقرر کیا ہے تو کیا وہ صحیح طور پر کیا ہے۔ مدعیہ کے وکیل جناب شوکت عزیز صدیقی صاحب نے عدالت عالیہ کے سامنے یہ مدعا رکھا کہ مدعا علیہ صاحب حیثیت ہونے کی بنا پر یہ استطاعت رکھتے ہیں کہ وہ بیوی بچے کو اتنا ہی نان و نفقہ دے جتنا کہ مدعیہ کی جانب سے مانگا گیا ہے۔ اپنے اس بات کے دلیل کے طور پر انھوں نے فیملی کورٹ کے سامنے مدعا علیہ کے شہادت سے وہ پیرا گراف نقل کیا ہے جس میں مدعا علیہ نے تسلیم کیا ہے کہ محکمہ انٹاک انرجی کی تنخواہیں اچھی ہیں کیونکہ مدعیہ کی جانب سے یہ دعویٰ تھا کہ مدعا علیہ محکمہ انٹاک انرجی میں کام کر رہے ہیں اور تقریباً ایک لاکھ روپے تک تنخواہ لیتے ہیں۔ مدعیہ کی جانب سے مزید یہ نکتہ اٹھایا گیا کہ فیملی کورٹ ایکٹ¹⁸¹ کے تحت نان و نفقہ مقرر کرنے سے پہلے عدالت کے پاس اختیار ہے کہ وہ مدعا علیہ کے جائیداد اور زرائع کا پتہ لگانے کے لیے کسی بھی ادارے سے ریکارڈ طلب کر سکتی ہے اور ان کی جانب سے مزید یہ بات رکھی گئی کہ فیملی کورٹ نے مدعا علیہ کے جائیداد اور زرائع

¹⁷⁹ This Important Judgement Can Be Searched and Cited as PLD 2022 LAHORE 840.

¹⁸⁰ ایڈووکیٹ پشاور بار ایسوسی ایشن و ممبر قانون دان ٹیم۔

¹⁸¹ The West Pakistan Family Courts Act, 1964.

کا پتہ لگانے کے لیے کسی محکمے سے کوئی ریکارڈ طلب نہیں کیا۔ مدعیہ کے وکیل کی جانب سے اپنی اس بات کے دلیل کے لئے عدالت عظمیٰ کے دو فیصلوں¹⁸² پر انحصار کیا ہے۔ جس میں عدالت عظمیٰ نے قرار دیا ہے کہ جہاں پر شوہر بیوی بچوں کے نان و نفقے کا ذمہ دار ہو تو فیملی کورٹ کو شش کرے گی کہ وہ شوہر کی تنخواہ اور آمدنی کا پتہ لگائے۔ مدعا علیہ کے وکیل زیشان منیر پراچہ صاحب نے اس مقدمے یعنی رٹ درخواست کی برقرار رہنے پر سوالات اٹھائے اور ساتھ میں اس بات پر زور دیا کہ فیملی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا جائے۔ ان کی جانب سے مزید یہ بات رکھی گئی کہ مدعا علیہ نیسکوم سکول میں چوکیدار کی حیثیت سے ۱۹ ہزار روپے ماہانہ وصول کر رہے ہیں اور اس لئے مدعا علیہ اس قابل نہیں کہ وہ مدعیان کو ان کے دعوے کے مطابق نان و نفقہ ادا کر سکے۔

عدالت عالیہ کی جانب سے فریقین کے دلائل سننے کے بعد اصل وجہ تنازعہ یہ بیان کی ہے کہ فیملی کورٹ دفعہ ۱۷ اے (چار) کے تحت بیوی بچوں کا نان و نفقہ کیسے مقرر کرے گی اور اس تنازعے کے اصل حل تک پہنچنے کے لیے عدالت نے اپنے سامنے تین سوالات رکھے ہیں جو کہ ذیل ہیں۔

1. کیا فیملی کورٹ کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی سے نان و نفقہ مقرر کرے یا پھر وہ نان و نفقہ مقرر کرنے کے لئے فیملی کورٹ ایکٹ کے دفعہ سترہ اے (چار) میں دئے گئے طریقہ کار کی پابند ہے؟

2. فیملی کورٹ ایکٹ ۱۹۶۳ کے دفعہ سترہ اے (چار)¹⁸³ میں مستعمل الفاظ "سیسٹمز" اور "ریسورسز" کا کیا مطلب ہے؟

3. کیا فریقین کے پاس مناسب شہادت یا ثبوت نہ ہونے کی صورت میں فیملی کورٹ کے پاس نان و نفقہ مقرر کرنے کے لیے فریقین کے دعوے کافی ہیں یا پھر فیملی کورٹ باقاعدہ خود شوہر کے اثاثہ جات کی انکوائری کر کے نان و نفقہ مقرر کرے گی؟

عدالت عالیہ نے اصل وجہ تنازعہ کے حل کے لئے اپنے سامنے سوالات سامنے رکھنے کے بعد بالترتیب تینوں سوالات کے جوابات کافی تفصیل کے ساتھ ذکر کئے ہیں جو کہ ذیل ہیں۔

پہلے سوال کا جواب عدالت عالیہ نے عدالت عظمیٰ کے مشہور فیصلے¹⁸⁴ کا حوالہ دے کر کچھ یوں آغاز کیا ہے کہ بیوی بچوں کی کفالت شوہر کی ذمہ داری ہے اور فیملی کورٹ از خود شوہر کے اثاثہ جات اور آمدنی کے تعین کے لئے کوشش کرے گی۔ یہاں پر جسٹس صاحب نے عدالت عظمیٰ کے ایک اور فیصلے¹⁸⁵ کا حوالہ دے کر فیملی کورٹ ایکٹ کے دفعہ ۱۷ اے کے پیچھے مقننہ کے مقصد کی وضاحت کی ہے اور یہ بات صراحتاً لکھی ہے کہ اس سیکشن کا مقصد بنیادی طور پر بے اصول شوہروں کی جانب سے مقدمات کو غیر ضروری طور پر طول دینے کو روکنا ہے۔ فیملی کورٹ ایکٹ اور سیکشن سترہ اے کے پیچھے مقننہ کے مقصد کے بعد جسٹس صاحب نے دفعہ ۱۷ اے اور بی کا متن نقل کر کے فیملی کورٹ کے پاس سیکشن سترہ بی کے تحت لوکل کمیشن مقرر کرنے کے اختیار کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد جسٹس صاحب نے فیصلے میں دفعہ ۱۷ اے (ایک) اور (چار) میں مذکور الفاظ "فکس" اور "فلگسنگ" کی وضاحت کی ہے۔ مندرجہ بالا تمام امور کی وضاحت کے بعد جسٹس صاحب نے بالآخر اس سوال کا جواب دیا ہے کہ فیملی کورٹ نان و نفقہ مقرر کرنے میں اپنی مرضی نہیں کر سکتی بلکہ نان و نفقہ مقرر کرنے کے لیے عقلی اور حقیقت پسندانہ روش اختیار کرے گی اور نان و نفقہ مقرر کرنے میں فریقین کی سماجی حیثیت، مدعا علیہ کی آمدنی اور مدعیہ کی ضروریات کو مد نظر رکھے گی۔ نان و نفقہ مقرر کرنے کی بابت طریقہ کار کی وضاحت کے بعد جسٹس صاحب نے محض ۱۷ اے کے دفعہ ۲۷ کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ شوہر تب تک بیوی کے نان و نفقے کا ذمہ دار ہے جب تک کہ وہ اس کی فرمانبرداری ہے۔ اس کے بعد جسٹس صاحب نے فقہ کی مشہور کتاب "ہدایہ" کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ فقہ میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو کہ زندگی کی لئے ضروری ہیں جیسا کہ روٹی، کپڑا اور رہائش وغیرہ۔ یہاں پر جسٹس صاحب نے اسلامی فقہ کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ نان و نفقہ کی ڈیمانڈ کے لئے بیوی کے لئے پہلے اپنے ڈیوٹی ادا کرنا یعنی شوہر کی فرمانبرداری ہونا ضروری ہے اور اگر کوئی بیوی خود ہی شوہر کے ساتھ رہنے سے انکاری ہو تو اس صورت میں وہ نان و نفقہ کی مستحق نہیں ہوگی۔ بیوی کے حق نان و نفقہ کے ذکر کے بعد فیصلے میں بچے کے حق نان و نفقہ کا ذکر ہے اور اس بابت جسٹس صاحب نے قرآن کریم سے استدلال کیا ہے۔ اور بچے کے حق نان و نفقہ کے لئے جسٹس صاحب نے مختلف فیصلوں¹⁸⁶ پر انحصار کیا ہے۔

¹⁸² PLD 2018 SC 819, 2019 MLD 820

¹⁸³ Section 17A (4). For purposes of fixing the maintenance, the Family Court may summon the relevant documentary evidence from any organization, body, or authority to determine the estate and resources of the defendant.

¹⁸⁴ PLD 2018 SC 819.

¹⁸⁵ PLD 2016 SC 613

¹⁸⁶ PLD 2103 SC 557, 2010 YLR 3275, 2106 SCMR 1821.

دوسرے سوال کے جواب کی طرف آنے سے پہلے جسٹس صاحب نے ان امور کی نشاندہی کی ہے جو کہ فیملی کورٹ کے لئے انٹیرم اور فائنل نان و نفقہ مقرر کرنے کے لیے ضروری ہیں جو کہ ذیل ہیں۔

- i. دعوے میں مذکور باتیں۔
- ii. ریکارڈ میں موجود دستاویزی ثبوت
- iii. جو ثبوت موجود نہ ہوں اس کو سمن کرنا
- iv. مدعا علیہ کی جائیداد کا تعین
- v. مدعا علیہ کے باقی ذرائع آمدن کا تعین

فیصلے کے مطابق فیملی کورٹ نان و نفقہ مقرر کرنے سے پہلے مندرجہ بالا امور کو دیکھنے کی پابند ہے اور جسٹس صاحب نے یہاں پر لکھا ہے کہ اس کیس میں فیملی کورٹ نے ان میں سے کسی بھی چیز کی طرف دھیان نہیں دیا اور صرف زبانی باتیں سن کر نان و نفقہ مقرر کیا ہے حالانکہ فیملی کورٹ آسانی کے ساتھ ریکارڈ کو طلب کر سکتی تھی اور اس کے علاوہ چونکہ مدعا علیہ خود یہ بات مان چکا تھا کہ اس نے تنخواہ کی بابت کوئی ثبوت جمع نہیں کیا تو اس صورت میں فیملی کورٹ کو خود دفعہ سترہ اے (چار) کے تحت مدعا علیہ کے جائیداد اور اثاثہ جات کے تعین کے لئے کوشش کرنی چاہیے تھی۔ اس کے بعد جسٹس صاحب نے کافی تفصیل سے "اسٹیٹ" اور "ریسورسز" پر روشنی ڈالی ہے اور اس بابت جسٹس صاحب نے انکم ٹیکس آرڈیننس ۲۰۰۱ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ مدعا علیہ کے اسٹیٹ اور ریسورسز کے تعین کے لئے مذکورہ آرڈیننس کے دفعہ ۱۱ اور ۳۹ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔

اس کے جسٹس صاحب تیسرے سوال کے جواب کی طرف آگے بڑھے ہیں اور عدالت عظمیٰ کے فیصلوں کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ فیملی کورٹ ایکٹ کے دفعہ سترہ اے کے تحت فیملی کورٹ کے لئے لازمی ہے کہ وہ از خود مدعا علیہ کے اسٹیٹ اور ریسورسز کے تعین کے لئے کسی بھی ادارے سے کوئی بھی ریکارڈ طلب کر سکتی ہے بلکہ دراصل یہ لازمی ہے کہ فیملی کورٹ خود باقاعدہ انکوائری کر کے مدعا علیہ کے اسٹیٹ اور ریسورسز کا تعین کرے کیونکہ فیملی کورٹ مساوات، عدل و انصاف کے اصولوں پر قائم ہے۔

مندرجہ بالا تمام سوالات کے جوابات کی تفصیلی وضاحت کے بعد جسٹس صاحب نے عدالت عظمیٰ، پاکستان، برطانیہ اور امریکہ کی اعلیٰ عدالتوں کے اس موضوع پر مختلف فیصلوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور ایک ایسی بحث کی ہے جو کہ حقیقی معنوں میں دیکھنے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔

اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں اور حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے جسٹس صاحب نے عدالت عظمیٰ کے فیصلے پر انحصار کر کے اس رٹ درخواست کو منظور کر کے اس کیس کے پچھلے تمام فیصلوں کو نان و نفقہ کی حد تک ختم کر کے یہ کیس دوبارہ فیملی کورٹ کے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ اس فیصلے اور فیملی کورٹ ایکٹ کے دفعہ ۱۱ اور ۱۱ میں ذکر کردہ اصولوں کے مطابق دو مہینوں کے اندر ایک نیا فیصلہ کرے۔

نوٹ: یہ فیصلہ لاہور عدالت عالیہ کے جج جسٹس جواد حسن نے لکھا ہے اور یہ فیصلہ اس لحاظ سے انتہائی اہم اور شاندار ہے کہ اس میں فیملی کورٹس کو فریقین کے درمیان ایک خاموش تماشائی بننے کی بجائے از خود مسئلے کے حل اور عدل و انصاف کی سر بلندی کے لئے خود انکوائری، ریکارڈ طلب کرنے کا پابند کیا ہے جو کہ حقیقتاً ایک تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔

پشاور عدالت عالیہ کا طلاق الفار کے بعد مر جانے کی صورت میں بیوہ کے حق وراثت کے حوالے سے اہم فیصلہ¹⁸⁷

حمزہ خان¹⁸⁸

¹⁸⁷ This important Judgement written by Justice Muhammad Ijaz Khan can be searched and cited as 2023 PLD Peshawar 88.

¹⁸⁸ ایڈووکیٹ خیبر پختونخواہ بار کونسل۔

عدالت کے سامنے سوال یہ تھا کہ اگر کوئی شوہر اپنی زوجہ کو مرض الموت میں طلاق دے، اور پھر اس کی عدت ختم ہونے سے پہلے فوت ہو جائے تو کیا بیوہ متوفی کے ترکہ میں شرعی و قانونی حصہ کی حقدارہ ہوگی یا نہیں؟

حقائق:

شاہ بخت روان نامی شخص کے فوت ہونے کے بعد اس کے ورثاء نے مرحوم کے بیٹے اکاؤنٹ میں موجود رقم کے حصول کے لئے درخواست برائے حصول جائیداد سرٹیفیکیٹ زیر دفعہ ۳۷۲ جانشینی ایکٹ، ۱۹۲۵ء دائر عدالت کی۔ متوفی بخت روان مدعی الیہ نمبر اکاؤنٹ، جبکہ مدعی علیہم نمبر ۱۰۳۲ اکاؤنٹ تھا۔ درخواست میں صراحتاً لکھا گیا کہ موجودہ مدعی مسماہ مسرت جو متوفی کی دوسری بیوی تھی، کو متوفی نے اپنی زندگی ہی میں طلاق بذریعہ دستاویز محررہ ۲۷ اگست ۲۰۱۸ء دی تھی، لہذا وہ متوفی کی شرعی و قانونی وارث نہ ہے۔ چونکہ مدعی مسماہ مسرت فریق مقدمہ نہ تھی، اس لئے اس نے عدالت میں درخواست برائے گردانے جانے فریق مقدمہ دائر کر کے مؤقف اپنایا کہ متوفی کی وفات کے وقت وہ متوفی کی بیوی تھی، اس لئے وہ متوفی کی شرعی و قانونی وارث ہے۔ مدعا علیہم نے جواب درخواست جمع کروایا اور مؤقف اپنایا کہ متوفی نے اپنی وفات سے بہت پہلے مدعی کو طلاق دی تھی، بدین وجہ وہ ترکہ متوفی میں کسی صورت حقدارہ نہ ہے۔ "ایشیوز" یعنی تحقیقات وضع ہوئے، مدعا علیہم نے گواہان [پی-ڈبلیو ۸۳] پیش کئے، جبکہ مدعی خود بطور [ڈی-ڈبلیو ۱] پیش ہوئی۔ عدالت نے مدعی کے خلاف اور مدعا علیہم کے حق میں حکم و فیصلہ محررہ ۲۴ جنوری ۲۰۲۰ء سن کر صرف مدعا علیہم کو جانشینی سرٹیفیکیٹ کا حقدار قرار دیا۔

سینئر سول جج/گارڈین جج کے مذکورہ بالا فیصلے سے نالاں ہو کر مدعی نے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج، سوات کی عدالت میں اپیل دائر کیا، تاہم عدالت نے مورخہ ۱۳ نومبر ۲۰۲۰ء کو اپنا حکم و فیصلہ سناتے ہوئے اپیل مدعی خارج کیا۔ مدعی نے مذکورہ بالا دونوں فیصلہ جات کو چیلنج کرنے کے لئے اس عدالت یعنی پشاور عدالت عالیہ میں نگرانی ۱۸۹ کے درخواست دائر کی۔

عدالت نے اپنے سامنے اصل سوالات کا تعین کرنے کے لئے اپنی بحث کا آغاز اس نکتے سے کیا کہ مبینہ طلاق بدعت زبانی طور پر نہیں دیا گیا تھا، بلکہ لکھ کر بذریعہ پوسٹ آفس مدعی کو بھجوا گیا تھا۔ لیکن متوفی تو عرصہ دو سال سے فالج کا مریض تھا۔ مدعا علیہم نے اپنے درخواست کے پیرا گراف نمبر ۱۳ اور ۴ میں اعتراف کیا ہے کہ متوفی نے مدعی کو بذریعہ دستاویز محررہ ۲۷ اگست ۲۰۱۸ء کو طلاق دی تھی اور متوفی مورخہ ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو وفات پا گیا ہے۔ یوں متوفی مبینہ طلاق نامے کے ۳۷ دن بعد فوت ہوا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ مبینہ طلاق دیتے وقت متوفی مرض الموت میں مبتلا تھا یا نہیں؟ کیا مبینہ طلاق محض مدعی کو ترکہ سے محروم کرنے کے لئے دیا گیا تھا یا نہیں؟

عدالت نے ان سوالات کے حل کے لئے گواہان کے بیانات کو توجہ کا مرکز بنایا۔ [پی-ڈبلیو ۱] عزیز احمد نے اپنے بیان میں اعتراف کیا: "امیر اولد فالج کا مریض تھا اور ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۸ء میں وفات ہوا تھا۔ اسی طرح [پی-ڈبلیو ۳] محمد ہارون نے بیان دے کر اعتراف کیا: "اس طرح مجھے یہ بھی معلوم نہ ہے کہ متوفی شاہ بخت روان کو جسم کے کن کن اعضاء پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ یہ درست ہے کہ مرنے سے تقریباً دو سال قبل سے متوفی شاہ بخت روان فالج زدہ تھا"۔ مذکورہ بالا بیانات اور مبینہ طلاق نامے کے متن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ متوفی عرصہ دو سال سے فالج کا مریض تھا اور مدعی ہی متوفی کی خدمت کیا کرتی تھی۔ چونکہ متوفی گھر تک محدود تھا اور روزمرہ کے امور سرانجام دینے سے قاصر تھا اور اس کا مرض بڑھتا چلا جاتا تھا، اس لئے یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ متوفی کو اس دار فانی سے کوچ کرنے کا احساس ہو گیا تھا جو کہ کسی بیماری کو مرض الموت قرار دینے کے لئے ضروری ہے۔ ڈاکٹر تنزیل الرحمن اپنی کتاب "مجموعہ قوانین اسلام" میں کسی بیماری کو مرض الموت قرار دینے کے لئے درج ذیل تین شرائط کا ذکر کرتے ہیں۔

1. مرض میں موت کا غالب امکان موجود ہو۔
2. مریض کے دماغ میں اس مرض سے مر جانے کا خدشہ موجود ہو۔
3. مرض کے سبب مرد یا عورت اپنے عام امور کو انجام دینے کی قدرت نہ رکھتے ہو۔

پس بادی النظر میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ لمبی بیماری کے سبب متوفی کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کا آخری وقت قریب آ گیا ہے اور وہ اس دنیا سے کوچ کرنے والا ہے۔ یہی وقت تھا جب متوفی نے مدعی کو مبینہ طور پر طلاق دی تھی۔ لہذا اب عدالت مبینہ طور پر مرض الموت میں دیئے جانے والے طلاق نامے کے مذہبی اور قانونی اثرات کا جائزہ لے گی۔

طلاق کی تین قسمیں یہ ہیں:

1. طلاق احسن: جو طہر میں ایک بار دی جائے اور اس کے بعد عدت کے ختم ہونے تک رجوع نہ کی جائے۔

2. طلاق حسن: جو تین طہور میں دی جائے اور اس دوران بیوی سے رجوع نہ کی جائے۔

3. طلاق بدعت / طلاق ثلاثہ: جو ایک ہی طہور میں بیک وقت تین دفعہ دی جائے۔ [تین جملوں میں یا ایک ہی جملے میں "تین" کا لفظ استعمال کر کے]

پہلی صورت میں فریقین کے درمیان اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ عدت کے ختم ہونے سے پہلے اگر شوہر فوت ہو جائے تو بیوہ شرعی حصہ کی حقدارہ ہوگی۔ اسی طرح دوسری صورت میں بھی فریقین متفق ہیں کہ اگر پہلی یا دوسری طلاق دینے کے بعد شوہر فوت ہو جائے تو بیوہ شرعی حصہ کی حقدارہ ہوگی۔ لیکن موجودہ کیس میں معاملہ طلاق بدعت / طلاق ثلاثہ کا ہے جس میں بیوہ کو بیک وقت تین طلاقیں دی جا کر نکاح اسی وقت ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ بنیادی مسئلہ رہ جاتا ہے کہ جب مرض الموت میں شوہر بیوی کو طلاق ثلاثہ دے، اور پھر اس کی عدت ختم ہونے سے پہلے فوت ہو جائے تو کیا وہ متوفی کے ترکہ میں قانونی وارث ہے کہ نہیں؟۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر منزیل الرحمن کی کتاب "مجموعہ قوانین اسلام" ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ "مرض الموت میں طلاق بائن کا اثر میراث پر"

حنفیہ مکتبہ فکر:

حنفی مذہب کی رو سے اگر کسی مرد نے مرض الموت کی حالت میں اپنی زوجہ کو طلاق بائن دی اور پھر مرد عورت کی عدت کے دوران اس مرض کی حالت میں مر گیا تو وہ عورت ورثہ کی مستحق ہوگی خواہ طلاق بائن ہو یا طلاق ثلاثہ۔ لیکن اگر وہ مرد عدت ختم ہونے کے بعد مر گیا تو وہ عورت وارث نہ ہوگی۔ امام محمد نے حضرت عمر فاروق کا ایک واقعی بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو حالت مرض میں تین طلاقیں دی تھیں۔ حضرت عمر نے قاضی شریح کو لکھا کہ اگر وہ عورت عدت میں ہو تو اس کو ورثہ دو۔ اگر عورت کی عدت گزر چکی ہو تو اس عورت کے لئے کوئی ورثہ نہیں۔ امام محمد کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔

امام مالک کا قول:

امام مالک سے منقول ہے کہ ہر ایک طلاق میں جو مرض کی حالت میں واقع کی گئی ہو، عورت میراث پانے کی مستحق ہوگی بشرطیکہ شوہر اسی مرض میں مرا ہو۔

امام شافعی کا قول:

امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر مرد نے مرض الموت میں طلاق بائن دی اور اس مرض میں مر گیا تو عورت وارث نہ ہوگی کیونکہ اس وقت نکاح ختم ہو چکا تھا، لہذا ورثہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

امام احمد بن حنبل کا نقطہ نظر:

امام احمد بن حنبل، ابن ابی لیلیٰ، اسحاق اور ابی عبید کے نزدیک اگر شوہر اسی مرض میں مرا ہو تو عورت وارث ہوگی خواہ عدت گزر چکی ہو، بشرطیکہ اس عورت نے دوسرے مرد سے نکاح نہ کیا ہو۔

شیعہ فرقہ کا مسلک:

شیعہ علماء کے نزدیک اگر شوہر تاریخ طلاق سے ایک سال کے اندر مر جائے تو عورت وارث ہوگی، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن، بشرطیکہ اس دوران میں عورت نے دوسرا نکاح نہ کر لیا ہو۔

اس موضوع پر مندرجہ بالا فقہ اسلامی سے یہ بات مثل خورشید واضح ہوتی ہے کہ طلاق رجعی کی طرح طلاق بائن یا طلاق ثلاثہ کی صورت میں بھی بیوہ کے حق وراثت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اگر متوفی مرض الموت میں اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس کی عدت ختم ہونے سے پہلے فوت ہو اور وہ موجودہ کیس میں سپینہ طلاق نامہ ۱۲ اگست ۲۰۱۸ کو تحریر ہوا تھا۔ اس حساب سے میعاد ۲ نومبر ۲۰۱۸ کو ختم ہونی تھی، مگر اس سے کئی دن پہلے ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۸ کو متوفی کی موت واقع ہوتی ہے۔ پس اپنے شوہر کی موت کے دن یعنی ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۸ کو مدعی متوفی کے ترکہ میں اپنے شرعی حصہ کی حقدارہ تھی۔ مزید برآں، متوفی نے خود ہی سپینہ طلاق نامے میں یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ عرصہ دو سال سے فالج کا مریض ہے اور مسماہ مسرت ہی اس کی خدمت کیا کرتی ہے۔ سو بظاہر وہ اپنی بیوی سے کافی خوش تھا، تاہم اس کے باوجود صرف ترکہ سے محروم کرنے کے لئے اس نے مدعی کو بغیر کسی وجہ کے طلاق دی ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایسے طلاق کو طلاق الفارک کہتے ہیں جو شوہر بیوی کو صرف ترکہ سے محروم کرنے کے لئے دیتا ہے۔ ایسی صورت میں بیوہ اپنے مرحوم شوہر کے ترکہ میں حق وراثت رکھتی ہے۔

